www.cpsglobal.org

الرسالہ
Al-Risala

March 2020 • Rs. 30



بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

March 2020 | Volume 45 | Issue 3

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: +91-8588822679
Tel. 011-41827083
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 30 per copy
Subscription by Book Post	₹ 300 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Al-Risala Monthly
Punjab National Bank
A/c No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000
Nizamuddin West Market Branch

Paytm
Mobile: 8588822679

To order books by Maulana Wahiduddin Khan,
please contact Goodword Books
Tel. 011-41827083, Mobile: +91-8588822672
Email: sales@goodwordbooks.com

Goodword Bank Details
Goodword Books
State Bank of India
A/c No. 30286472791
IFSC Code: SBIN0009109
Nizamuddin West Market Branch

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

خصوصی شمارہ: **موجودہ مسلمان**
مسائل اور امکانات

فہرست

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi. Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd., A46-47, Sector 5, Noida-201301. Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan. Total Pages:52

فئۃ قلیلۃ، فئۃ کثیرۃ

قرآن معروف معنوں میں صرف شریعت کی ایک کتاب نہیں ہے۔ بلکہ وہ فطرت کی کتاب ہے، اوراس اعتبار سے تخلیق کے تمام قوانین کا اس سے تعلق ہے، خواہ براہِ راست ہو یا بالواسطہ۔ انھیں قوانین فطرت میں سے ایک قانون وہ ہے، جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: كَمۡ مِنۡ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذۡنِ اللَّهِ (2:249)۔ یعنی کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔

اس آیت کے مطابق، اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کون گروہ عددی اعتبار سے اقلیت میں ہے، اور کون گروہ عددی اعتبار سے اکثریت میں ہے۔ بلکہ فطرت کے قانون کے مطابق، عددی اکثریت اور عددی اقلیت دونوں اضافی (relative) الفاظ ہیں۔ اس دنیا میں اصل فیصلہ اذن اللہ (فطرت کا قانون) کرتا ہے۔ جو گروہ اذن اللہ (فطرت کے قانون) کے مطابق اپنی درست منصوبہ بندی کرے گا، وہ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھ جائے گا، اور جو فریق فطرت کے قانون کے مطابق درست منصوبہ بندی میں ناکام رہے گا، وہ بظاہر حالات کا مالک ہوتے ہوئے بھی زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔

وہ قانون فطرت کیا ہے۔ وہ ایک محرک عمل ہے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ جو گروہ عددی اعتبار سے بظاہر اقلیت میں ہو، اس کے افراد میں ایک فطری اسپرٹ جاگتی ہے۔ اس اسپرٹ کو داعیہ یا محرک (incentive) کہا جاتا ہے۔ یہ داعیہ ہر اقلیتی گروہ میں لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ رہنمائی کرنے والے غلط رہنمائی (mislead) کرکے لوگوں کے ذہن کو بگاڑ نہ دیں۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگر لوگوں کے ذہن کو بگاڑا نہ جائے تو فطرت ضرور اپنا عمل کرتی ہے، اور جب فطرت درست انداز میں اپنا عمل کرتی ہے، تو عددی اقلیت والے افراد اپنے آپ غیر تخلیقی گروہ سے ترقی کرکے تخلیقی گروہ بننا شروع ہو جاتے ہیں، اور اگر کوئی رہنما مس لیڈ (mislead) نہ کرے، تو یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ فئۃ قلیلۃ ترقی کرتے ہوئے فئۃ کثیرۃ بن جاتا ہے۔

چیلنج، مواقع

اکثر لوگ حالات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حالات ہمارے لیے موافق نہیں ہیں۔ ایسے مقام پر کیا کرنا چاہیے۔ میں کہوں گا کہ قرآن میں آیا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ (90:4)۔یعنی ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکلات (hardship) انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔وہ ہمیشہ موجود رہیں گے۔ایسی حالت میں مشکلات کے حوالے سے سوچنا بجائے خود درست نہیں۔

انسان کو کبد یا عُسر (hardship) کے اندر پیدا کیا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کبد زندگی کا لازمی حصہ ہے۔اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ کبد کو لے کر اپنی زندگی کا منصوبہ نہ بنائے، بلکہ کبد کے اندر جو موافق امکانات موجود ہیں، ان کو لے کر اپنی زندگی کی پلاننگ کرے۔انسان کا منصوبہ مبنی بر غیر موافق حالات نہیں ہونا چاہیے، بلکہ مبنی بر موافق حالات ہونا چاہیے۔

انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کے لیے اس دنیا میں صرف مشقت ہی مشقت ہے، اس کے لیے اس دنیا میں آسانی کی کوئی بات نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایک ایسی دنیا میں پیدا کیا گیا ہے، جہاں انسان کے لیے مواقع (opportunities) تو بہت زیادہ ہیں، لیکن ان مواقع کے ساتھ چیلنجز بھی موجود ہیں۔آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ چیلنج کے درمیان مواقع کو تلاش کرنا سیکھے، وہ چیلنج کو مینج (manage) کرکے اپنی دنیا بنائے۔ایسا اس لیے ہے تاکہ انسان کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اپنی عقل کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرے، وہ اپنی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ بنائے۔

چیلنج کا مقابلہ کرکے جب انسان اپنا مقصد حاصل کرتا ہے، تو وہ ایسے مراحل سے گزرتا ہے، جو اس کے اندر تخلیقیت (creativity) پیدا کرنے والی ہیں، جو انسان کو مین (man) سے اٹھا کر سوپر مین (super-man) بنانے والی ہیں۔

کتاب اور حکمت

قرآن میں متعدد مقامات پر بتایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو دو چیزیں دے کر بھیجا ہے— کتاب اور حکمت (البقرۃ، 2:129، آل عمران، 3:164، النساء، 4:113، الاحزاب، 33:34، الجمعۃ، 62:2، وغیرہ)۔ کتاب سے مراد ہے اللہ کی آخری کتابِ ہدایت قرآن ہے، اور حکمت سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب کو بطور مشن لے کر اٹھنے کی صورت میں جو حالات پیدا ہوں گے، ان کو کس طرح حکمت کے ساتھ مینج کرتے ہوئے آخری منزل تک پہنچایا جائے۔

رسول اللہ کی 23 سالہ زندگی اس بات کا عملی نمونہ ہے۔ اس پیغمبرانہ وزڈم کا ایک اصول حضرت عائشہ نے ان الفاظ میں بیان کیا: مَا خُيِّرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6786)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو معاملے کے درمیان اختیار دیا گیا، تو آپ نے آسان تر کا انتخاب کیا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایسر سے مراد پرامن، یعنی غیر نزاعی طریقہ ہے۔ اجتماعی زندگی میں ڈیلنگ کے عملاً دو طریقے ہیں— نزاعی اور غیر نزاعی (non-confrontational method)۔ پیغمبر اسلام کا طریقہ نزاعی طریقہ نہیں تھا۔ بلکہ مکمل طور پر غیر نزاعی طریقہ تھا۔ غیر نزاعی طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ فوراً اسٹارٹنگ پوائنٹ مل جائے، اور مشن کسی رکاوٹ کا شکار ہوئے بغیر اسموتھ (smooth) انداز میں اپنے راستے پر چلتا رہے۔

اس طریق کار کو دوسرے انداز میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ راستے کی رکاوٹ سے ٹکراؤ کرنے کے بجائے اس کو مینج کرکے اپنا راستہ نکالنا۔ مثلاً کعبہ کے بت بظاہر دائیٔ توحید کے لیے ایک رکاوٹ تھے، مگر آپ نے اس رکاوٹ کو مینج کیا۔ آپ نے کعبہ کے پاس جمع ہونے والے بت پرستوں کے مجمع کو اپنے لیے آڈینس (audience) بنا لیا، اور اس طرح سارے عرب میں نہایت پیس فل انداز میں توحید کی دعوت کو پھیلا دیا۔ اسی طریقے کا نام حکمت ہے۔

فرقان کیا ہے

مومن کے لیے ایک خدائی عطیہ وہ ہے، جس کو قرآن میں فرقان کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی متعلق آیت ان الفاظ میں آئی ہے: یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ یَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا (8:29)۔ یعنی اے ایمان والو، اگر تم اللہ سے ڈرو، تو اللہ تمہارے لیے فرقان عطا کرے گا۔

فرقان کا لفظی مطلب ہے فرق کرنے والا، یعنی انسان کی یہ صلاحیت جس کے ذریعے وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق (differentiate) کر سکے۔ یہ فرق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک، مادی فرق اور دوسرا، معنوی فرق۔ مادی فرق کو جاننا بہت آسان ہے۔ کیوں کہ اس معاملے میں ایک چیز سخت ہوتی ہے، اور دوسری چیز نرم، ایک چیز گرم ہوتی ہے، اور دوسری چیز ٹھنڈی، ایک چیز کھانے کے قابل ہوتی ہے، اور دوسری چیز کھانے کے قابل نہیں ہوتی۔ لیکن معنوی فرق کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ یہاں فرق کو جاننے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر فرق کو سمجھنے کا اکیوٹ سنس (acute sense) موجود ہو۔ اسی کے ساتھ آدمی کے اندر وہ ذوق موجود ہو، جو اس کو مجبور کرے کہ وہ اس فرق کو اپنے معاملات میں استعمال کرے۔

مثلاً مبنی بر عداوت تحریک، اور مبنی بر دعوت تحریک۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ کیوں کہ دعوتی عمل خیر خواہی کی بنیاد پر چلتا ہے، اور خیر خواہی عداوت کی ضد ہے۔ جو آدمی اس معاملے میں حساس (sensitive) نہ ہو، وہ دعوت کی بات کرے گا، اور اسی کے ساتھ وہ عداوت کا طریقہ بھی اختیار کرے گا۔ اس کے برعکس، جو آدمی اس معاملے میں حساس ہو، وہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ صاحبِ دعوت ہونے کا دعویٰ کرے، اور اسی کے ساتھ وہ لوگوں کے خلاف عداوت کی باتیں بھی کرتا رہے۔ وہ یہ بھی کہے کہ مسلمان کو لوگوں کے درمیان نافع (giver group) بن کر رہنا چاہیے، اور اسی کے ساتھ وہ شکایت اور ظلم کی باتیں لے کر پرجوش تقریریں بھی کرے۔ فرقان کی یہ صلاحیت صحیح معنوں میں اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہو۔

حالات کی رعایت

مسلمانوں میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہمیں دو چیزوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنا کام کرنا چاہیے، اور وہ ہے قرآن اور سنت۔ مگر عملی اعتبار سے یہ مکمل بات نہیں۔ بلاشبہ مسلمان کے لیے قرآن وسنت واحد ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ مسلمان وقت کے تقاضے کو سمجھیں، اور وقت کے تقاضوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی دینی پلاننگ انجام دیں۔

مثلاً جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو اس سفر کے لیے آپ نے ایک مشرک کو اپنے سفر کا رہنما بنایا۔ سیرت کی کتابوں میں اس کا نام عبداللہ بن اُریقِط یا اُرَیْقَط (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 488) بتایا گیا ہے۔ یہ ایک طریقے کی بات تھی، جو قرآن میں پہلے سے لکھا ہوا موجود نہ تھا، وہ حالات کا تقاضا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے تقاضے کی رعایت کرنا، کام کی درستگی کا ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس تیسرے عمل، یعنی حالات کے تقاضے کو سمجھیں، ورنہ وہ اپنی منصوبہ بندی میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

حالات کے تقاضے کو سمجھنا، اور اس کی رعایت کرنا، منصوبہ بندی کو کامیاب کرتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے، جب کہ انسان کھلے ذہن کے ساتھ حالات کو سمجھنے کی کوشش کرے، اور بغیر کسی ریزرویشن کے حالات کے مطابق اپنے کام کو آگے بڑھائے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے اس راز کو نہیں سمجھا کہ موجودہ زمانہ جدید ٹکنالوجی کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ جدید تقاضوں کو سمجھیں، اور اس کو اپنی تعمیر میں استعمال کریں۔

پیغمبرِ اسلام کی سنت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے ایک طرف وحی کی پیروی کی، اور دوسری طرف حالات کے تقاضے کو سمجھ کر ہمیشہ حکمت پر مبنی پلاننگ کی۔ آپ نے ہمیشہ ٹکراؤ سے اعراض کرتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنایا۔ آپ ہمیشہ دوسروں کے لیے ناصح (خیر خواہ) بنے رہے۔ آپ نے اس حکمت کو اتنا زیادہ اختیار کیا کہ آپ نے آخری حد تک خیر خواہی کا حق ادا کردیا۔

محفوظ کا تحفظ

دیوبند کے دو عالم ملاقات کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ میں نے جو گفتگو کی، اس کا خلاصہ میں نے اپنی ڈائری میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ”ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کل جگہ جگہ تحفظِ ختمِ نبوت کانفرنس ہو رہی ہے۔ میں اس قسم کی کانفرنسوں کو بالکل بے معنی سمجھتا ہوں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تحفظِ آفتاب کانفرنس منعقد کی جائے۔ سورج براہ راست خدا کی طاقت سے قائم ہے، اس کے لیے تحفظ آفتاب کانفرنس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح نبوت کی حفاظت بھی خدا نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ اس کے لیے بھی یہ ضرورت نہیں کہ تحفظ نبوت کانفرنس منعقد کی جائے۔ مسلمانوں کی اصل ذمے داری پیغام نبوت کی پیغام رسانی ہے۔ یعنی پیغمبر نے اپنے بعد جو دین چھوڑا ہے، اس کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچانا۔ موجودہ زمانے کے مسلمان دعوتِ نبوت کا کام نہیں کرتے، البتہ وہ تحفظِ نبوت کی کانفرنس کر رہے ہیں۔ اس قسم کا فعل مسلمانوں کی اصل مسئولیت کا کسی بھی درجے میں بدل نہیں۔“ (ڈائری، 5 دسمبر 1989)

تحفظ ختم نبوت کا مطلب کیا ہے۔ بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت کا عقیدہ خطرے میں ہے، اس کو بچاؤ۔ مگر سوال یہ ہے کہ کہاں خطرے میں ہے، اور کون اس کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اس کا حقیقی جواب کسی کے پاس نہیں۔ یہ ایک مفروضہ خطرے پر کانفرنس منعقد کرنا ہے۔ اس مسئلے پر اگر کچھ کام کرنا ہے، تو وہ نبوت کے عقیدے پر ایسی کتابیں لکھنا ہے، جو علمی اور تاریخی دلائل کی بنیاد پر تیار کی گئی ہوں۔ ایسی کتابیں، جن سے لوگوں کو پیغمبر کی رہنمائی پر یقین حاصل ہو۔ ایسی کتابیں، جو لوگوں کے ایمان میں اضافہ کرنے والی ہوں۔ ایسی کتابیں، جو موجودہ عقلی دور میں لوگوں کے لیے عقل کی بنیاد پر اس عقیدے کو قابل فہم بنائیں۔ یہ کتابیں سب وشتم کی زبان میں نہیں ہونا چاہیے، بلکہ عقلی دلائل کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ یہ زمانہ عقلی تفہیم وتبیین کا زمانہ ہے۔ کوئی اور اسلوب آج کے انسان کے لیے مؤثر نہیں ہوسکتا۔

دین کی عصری تفہیم

ایک لمبی روایت صحابیِ رسول کے حوالے سے حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کا ایک جزیہ ہے۔ آپ نے کہا: وَعَلَى الْعَاقِلِ أَنْ يَكُونَ بَصِيرًا بِزَمَانِهِ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 361)۔ یعنی دانش مند کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے سے باخبر ہو۔ بصیرت زمانی کی یہ صفت زندگی کے عام معاملات کے لیے بھی ہے، اسی کے ساتھ دین کو زمانے کی نسبت سے سمجھنے کے لیے بھی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات مومنِ مجتہد کے لیے کہی گئی ہے۔ اجتہاد اہلِ اسلام کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اجتہاد کی خاص شرط کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مومن مجتہد قرآن وسنت کی گہری واقفیت کے ساتھ اپنے زمانے کے حالات سے بھی بخوبی طور پر واقف ہو۔ تاکہ وہ زمانے کے تقاضے کے مطابق اسلامی تعلیم کی نئی تشریح کرسکے۔ ایسی تشریح جس میں اسلام کی تعلیمات کی بھرپور طور پر تعمیل موجود ہو، اور اسی کے ساتھ اس میں زمانے کے حالات کے مطابق اہل اسلام کو درست رہنمائی حاصل ہوتی ہو۔

اجتہاد دوسرے الفاظ میں اسلام کی دانش مندانہ تعبیر ہے۔ جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ قرآن و سنت سے واقف ہو، لیکن اس کے اندر دانش مندی کی صفت نہ ہو، تو وہ دین کو درست طور پر نہیں سمجھے گا۔ وہ درست طور پر لوگوں کو دینی رہنمائی نہ دے سکے گا۔ وہ دین کو تطبیقی انداز (applied way) میں پیش نہ کرسکے گا۔

دین کی عصری تفہیم کا مطلب صرف یہ ہے کہ ابدی دین کو وقت کے اسلوب (idiom) میں بیان کرنا۔ دینی متن (religious text) کا ترجمہ اگر صرف ترجمہ ہے تو اس کی عصری تفہیم کا مطلب ترجمہ پلس (translation plus) ہے، یعنی سطور (lines) کے ساتھ بین السطور (between the lines) کا بیان۔

اجتہاد کیا ہے

اجتہاد کیا ہے۔ اجتہاد یہ ہے — کسی حکم شرعی پر عمل کرنے میں جب حالات کی تبدیلی کی بنا پر فرق واقع ہوجائے، تو اس وقت حکم کو ظاہری صورت کے اعتبار سے دیکھنے کے بجائے حکم کو ری ڈیفائن کرنا تاکہ اسپرٹ پوری طرح باقی رہے، لیکن فارم کو اس طرح بدلا جائے کہ وہ مطابقِ حال ہوجائے۔

اس کی ایک رہنما مثال پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور کا ایک واقعہ ہے۔ آپ نے ایک بار مدینہ سے صحابہ کی ایک جماعت کو بنو قریظہ کی طرف بھیجا۔ بنو قریظہ ایک یہودی قبیلہ (Jewish tribe) تھا۔ یہ قبیلہ مدینہ سے جنوب کی جانب آباد تھا۔ اس واقعے کا ذکر روایتوں میں آیا ہے، اس کا متعلق جزیہ ہے: لما انصرف المشركون عَن الخندق وَرَجَعَ رَسُول اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فَدَخَلَ بيت عَائِشَةَ أتاه جبريل فوقف عند موضع الجنائز فَقَالَ: عذيرك مِن محارب! فخرج إِلَيْهِ رَسُول اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - [فزعا فَقَالَ: إن الله يأمرك أن تسير إلى بني قريظة فإني عامد إليهم فمزلزل بهم حصونهم. فَدَعَا رَسُولُ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - عليا. رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ. فدفع إِلَيْهِ لواءه وبعث بلالا] فنادى فِي النَّاسِ إِنَّ رَسُول اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - يأمركم ألا تصلوا العصر إلا فِي بني قريظة (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، 2/57)۔ بعض روایتوں میں یہ اضافہ ہے: فَأَدْرَكَ بَعْضَهُمُ العَصْرُ فِي الطَّرِيقِ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: لاَ نُصَلِّي حَتَّى نَأْتِيَهَا، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: بَلْ نُصَلِّي، لَمْ يُرِدْ مِنَّا ذَلِكَ، فَذُكِرَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمْ يُعَنِّفْ وَاحِدًا مِنْهُمْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 946)۔ ان میں جن لوگوں نے نماز پڑھی ان لوگوں نے یہ کہا: لم يرد رسول الله ترك الصلاة، إنما أراد تعجيل السير (الفصول فی السیرۃ، ابو الفداء ابن کثیر، 1/171)۔

ان روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے صحابہ کی ایک جماعت کو غزوۂ خندق کے بعد بنو قریظہ کی طرف بھیجا، اور بھیجتے ہوئے آپ نے تاکید کے ساتھ یہ کہا کہ تم لوگ عصر کی نماز بنو قریظہ

کی بستی میں پہنچ کر ہی ادا کرنا۔ مگر بنو قریظہ کی بستی تک پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ یہاں تک کہ ایسا لگنے لگا کہ بنو قریظہ تک پہنچنے سے پہلے عصر کا وقت ختم ہو جائے گا۔ اس لیے کچھ لوگوں نے بنو قریظہ تک پہنچنے سے پہلے ہی عصر کی نماز پڑھ لی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا تو آپ نے کسی کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ نماز پڑھنے والے صحابہ نے کہا: رسول اللہ کی مراد نماز ترک کرنا نہیں تھا، بلکہ آپ کی مراد تیزی کے ساتھ سفر کرنا تھا۔

فَذُكِرَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمْ يُعَنِّفْ وَاحِدًا مِنْهُمْ (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا تو آپ نے کسی کے خلاف کچھ نہیں کہا)۔ رسول اللہ کے اس عمل سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا، اس کا مفہوم یہ تھا کہ تم دونوں درست ہو کہ تم میں سے ایک گروہ نے حکم کی لفظی پیروی کی، اور تم میں سے دوسرے گروہ نے حکم کی اجتہادی پیروی کی ہے۔

تجدیدی کام

مشہور حنفی فقیہ زین الدین ابن نجیم (970-926ھ) نے اپنی کتاب الْأَشْبَاهُ وَالنَّظَائِر میں لکھا ہے: قَالَ بَعْضُ الْمَشَايِخِ: الْعُلُومُ ثَلَاثَةٌ: عِلْمٌ نَضِجَ وَمَا احْتَرَقَ؛ وَهُوَ عِلْمُ النَّحْوِ، وَعِلْمُ الْأُصُولِ. وَعِلْمٌ لَا نَضِجَ وَلَا احْتَرَقَ؛ وَهُوَ عِلْمُ الْبَيَانِ وَالتَّفْسِيرِ. وَعِلْمٌ نَضِجَ وَاحْتَرَقَ؛ وَهُوَ عِلْمُ الْفِقْهِ وَالْحَدِيثِ (الْأَشْبَاهُ وَالنَّظَائِرُ عَلَى مَذْهَبِ أَبِي حَنِيْفَةَ النُّعْمَانِ لابن نجيم المصري، دار الكتب العلمية، بیروت، 1999، صفحہ 330)۔ یعنی بعض مشائخ نے کہا ہے کہ علم تین ہیں، ایک وہ علم، جو نضج کو پہنچ گیا، مگر فنا نہیں ہوا۔ یہ نحو اور اصول کا علم ہے۔ دوسرا وہ علم ہے، جو نہ نضج کو پہنچا، اور نہ فنا ہوا۔ یہ بیان اور تفسیر کا علم ہے۔ تیسرا وہ علم جو نضج کو پہنچ گیا، اور فنا ہو گیا۔ یہ فقہ اور حدیث کا علم ہے۔ یہ بات شافعی فقیہ بدر الدین محمد بن عبد اللہ الزرکشی (وفات 794ھ) نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے (المنثور في القواعد الفقهية، وزارة الأوقاف الكويتية، 1985، جلد 1، صفحہ 72)۔

نضج کا مطلب ہے پختگی کی حد کو پہنچ جانا (fully developed)۔ راقم الحروف کا اپنے مطالعے کے مطابق، یہ خیال ہے کہ تمام وہ علوم جو اسلامی علوم کہے جاتے ہیں، انطباق کے اعتبار سے

ان کے دو درجے ہیں — روایتی انطباق (traditional application)، عصری انطباق (contemporary application)۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ روایتی اعتبار سے تمام علوم پر اتنا کام ہوا ہے کہ وہ نضج کے درجے تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن دورِ سائنس، جو روایتی دور سے بالکل مختلف ہے، اس دور کے اعتبار سے یہ ضرورت ابھی باقی ہے کہ تمام علوم کو دورِ جدید کے معیار پر دوبارہ مدون کیا جائے۔ اس دوسرے پہلو سے تمام علوم ابھی تک غیر نضج کی حالت میں ہیں۔ غالباً کوئی بھی علم نضج کے درجے تک نہیں پہنچا۔

مثلاً عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فقہ کا علم نضج کے درجے تک پہنچ چکا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فقہ اس معاملے میں مستثنیٰ (exception) نہیں۔ مثال کے طور پر کئی عمل ایسے ہیں، جن کے بارے میں فقہاء یہ کہتے ہیں کہ یقتل حدا (بطور حد قتل کیا جائے گا)۔ جیسے ترک صلاۃ، ارتداد، شتم رسول، وغیرہ۔ اسی طرح فقہا نے دنیا کو دار الاسلام اور دار الحرب کے خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے، وغیرہ۔

اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس قسم کے فتاویٰ زمانی تقاضے کے تحت بنے ہیں، جو موجودہ زمانے میں غیر متعلق (irrelevant) ہو چکے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ خود علما کے عمومی مسلک کے مطابق اس قسم کے فتاوی پر نظر ثانی کی جائے۔ علما کے اس مسلک کی نمائندگی کرتے ہوئے ابن القیم (1292-1350ء) نے اپنی کتاب اِعلام الموقعین عن رب العالمین میں ایک مستقل باب لکھا ہے، اس باب کا عنوان یہ ہے: فَصْلٌ فِي تَغْيِيرِ الْفَتْوَى، وَاخْتِلَافِهَا بِحَسَبِ تَغَيُّرِ الْأَزْمِنَةِ وَالْأَمْكِنَةِ وَالْأَحْوَالِ وَالنِّيَّاتِ وَالْعَوَائِدِ (فصل: زمانہ، مقامات، حالات، نیتوں اور ضروریات کے بدل جانے کی بنیاد پر فتوی کی تبدیلی، اور ان میں فرق)۔

فارم، اسپرٹ

عباسی دور میں فقہ کی تدوین ہوئی۔صحابہ کے دوراور تابعین کے دور میں عام طور پر مبنی براسپرٹ دیں کا تصور پایا جا تا تھا،لیکن فقہاء کے دور میں بعض اسباب سے مبنی بر فارم دین کا تصور عام ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس بارے میں لوگ غلو(انتہا پسندی) کی حد تک پہنچ گئے۔صحابہ اور تابعین کے زمانے میں دین میں اصل اہمیت اسپرٹ کی ہوتی تھی۔اس بنا پر اس زمانے میں جزئی نوعیت کے طرق عبادت میں تنوع کا تصور پایا جا تا تھا۔ یہ تصور اس حدیث پر مبنی تھا: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ فَبِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (جامع بیان العلم وفضلہ، حدیث نمبر 1684) ۔یعنی میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں،تم ان میں سے جن کی بھی اقتدا کرو گے، ہدایت پر رہو گے۔

لیکن بعد کے زمانے میں جب کہ طرق عبادت میں تعدد کا ذہن ختم ہو گیا،اور فارم میں تو حد پر زور دیا جانے لگا تو اس قسم کا ذہن ختم ہو گیا۔مگر یہ طریقہ بلاشبہ درست طریقہ نہیں۔ کیوں کہ اس روایت کے علاوہ بھی ایسی صحیح روایات ہیں، جس میں تعدد کا ثبوت ملتا ہے۔مثلاً رسول اللہ کے زمانے میں ایک صحابی کا بلند آواز سے کہنا: رَبَّنَا وَلَكَ الحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 799) ۔روایت کے مطابق، یہ کلمہ سن کر آپ نے اس کی تحسین کی، جب کہ رسول اللہ نے پہلے کبھی اس کی تعلیم نہیں دی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ عبادت کے جزئی طریقوں میں اسپرٹ اصل ہے۔اس معاملے میں اگر اسپرٹ کو اصل مانا جائے تو اپنے آپ فرقہ بندی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس، اگر عبادت کے جزئی طریقوں میں فارم پر زور دیا جانے لگے تو فرقہ بندی کا دروازہ کھل جاتا ہے، جو کبھی بند نہیں ہوتا۔عہدِ رسالت میں عبادت کا صرف ایک تصور پایا جاتا تھا، وہ ہے عبادت میں اسپرٹ پر زور۔عبادت میں فارم پر زور دینے کا تصور بعد کے زمانے میں پیدا ہوا، اور پھر تاریخ میں عام ہو گیا۔ تاہم مبنی بر اسپرٹ عبادت ہی اصل عبادت ہے(صحیح البخاری، حدیث نمبر 757) ۔

دعوتی حکمت

ہر زمانے میں کام کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً قدیم عرب میں مختلف مقامات پر اصنام (idols) ہوا کرتے تھے۔ لوگ ان اصنام کے نام پر سفر کیا کرتے تھے۔ اس طرح عرب میں ایک قسم کا سیاحت کلچر (tourist culture) رائج ہو گیا تھا۔ رسول اور اصحابِ رسول نے اس سیاحت کلچر کو بڑے پیمانے پر دعوتی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اس بنا پر ایسا ہوا کہ تھوڑے وقت میں دین توحید کا پیغام سارے عرب میں پھیل گیا۔

موجودہ زمانے میں ایک نیا کلچر رائج ہوا ہے، جس کو لیڈیز فرسٹ (ladies first) کہا جاتا ہے۔ اس کلچر کے تحت ایسا ہوا ہے کہ اجتماعی مواقع پر عورتوں کو ترجیح (preference) دی جاتی ہے، ان کو پہلے موقع دیا جاتا ہے۔ یہ کلچر دعوت کے کام کے لیے بہت مفید ہے۔ چنانچہ ہمارے ساتھی جب قرآن یا لٹریچر پھیلانے کے لیے کہیں جاتے ہیں، اور وہ دیکھتے ہیں کہ وہاں لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، تو خواتین آگے بڑھ کر دعوتی کام میں حصہ لیتی ہیں۔ تمام لوگ بہت عزت کے ساتھ ترجمۂ قرآن اور تعارفِ اسلام پر مشتمل لٹریچر لیتے ہیں۔ اس طرح دعوت کے کام میں بہت آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی کا نام حکمت ہے۔ جو لوگ دعوتی کام کر رہے ہیں، ان کو چاہیے کہ موقع کے لحاظ سے دعوت کے لیے حکمت کا طریقہ اختیار کریں۔ دعوتی حکمت کس طرح دریافت ہوتی ہے، اس کا جواب ایک پرانی مثل میں ملتا ہے: جوئندہ یابندہ، یعنی ڈھونڈنے والا پاتا ہے— ڈھونڈنے والے بنئے، چیزیں آپ کو اپنے آپ مل جائیں گی۔ مطلوب چیزوں کی کوئی فہرست نہیں بنتی۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ مل جاتی ہیں۔ آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ ڈھونڈنے والا بنے۔ اس کے بعد اپنے آپ اس کے اندر جستجو کی اسپرٹ پیدا ہو گی۔ وہ اپنے آپ متلاشی انسان بن جائے گا۔ دعوتی حکمت اختیار کرنے کے لیے کس چیز سے بچنا چاہیے۔ اس کے لیے سب سے ضروری چیز ہے، اپنے آپ کو بھٹکاؤ (distraction) سے بچانا، اور یکسوئی کے ساتھ اپنے مطلوب کی تلاش میں لگے رہنا۔

قولِ بلیغ

ایک مسلم نوجوان جو نیوزی لینڈ میں رہتے ہیں، انھوں نے اپنا تجربہ بیان کیا: نیوزی لینڈ کے باشندے بہت اچھے ہیں۔ مگر یہاں کی نئی نسل میں ایک خرابی یہ دیکھنے کو ملتی ہے کہ یہ لوگ خدا کے تعلق سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہیں، نہ ہی خدا کا نام لیتے ہیں۔ بلکہ اگر ان کے سامنے خدا کا نام لیا جائے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتے۔ ایسی صورت حال میں ان کے درمیان دعوت کا کام کیسے کیا جائے۔

جس مزاج کا ذکر آپ نے کیا، اس مزاج کے لوگ آج کی دنیا میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ میں نے ایسے لوگوں کے کیس کو بہت زیادہ سمجھنے کی کوشش کی۔ میری سمجھ میں آیا کہ یہ لوگ آزادی کو خیر اعلیٰ (summum bonum) سمجھتے ہیں۔ وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن خود اپنی آزادانہ رائے سے، نہ کہ کسی برتر ہستی کے حکم سے۔ ان کے لیے یہ بات ناقابل قبول ہے کہ وہ کسی کے آگے سرینڈر کریں، اور ان کی ماتحتی قبول کرتے ہوئے اچھے کام کریں۔ وہ اچھے کام کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن خود اپنے آزادانہ فیصلے کے تحت، نہ کہ اپنے سے باہر کسی حکم کے تحت۔

ان کے ذہن کو ایڈریس کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ان کو ملحد اور منکر بتایا جائے۔ ان سے یہ کہنا چاہیے کہ آپ کے اندر سب کچھ ہے، لیکن آپ کے اندر حقیقت پسندانہ فکر (realistic approach) موجود نہیں۔ اپنے خالق کو ماننا یا نہ ماننا، محدود معنوں میں ایک مذہبی رویہ نہیں ہے، بلکہ وہ غیر حقیقت پسندانہ سوچ (unrealistic approach) ہے، اور غیر حقیقت پسندانہ سوچ اتنی زیادہ غیر عقلی (irrational) ہے کہ کوئی صاحب عقل انسان اس کا تحمل نہیں کرسکتا۔

خدا کے پیدا کیے ہوئے وجود کی صورت میں جینا اور خدا سے بے خبر رہنا، خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا میں جینا مگر خدا کا اقرار نہ کرنا، خدا کی دی ہوئی عقل سے سوچنا اور خدا کا اعتراف نہ کرنا، ایک ایسا تضاد ہے جس کا ایک صاحب فکر آدمی تحمل نہیں کرسکتا۔ ایسے لوگوں کو اگر ان کے اس فکری تضاد سے باخبر کردیا جائے تو یقیناً وہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

آج کی نوجوان نسلیں

موجودہ زمانے کے نوجوانوں کا مسئلہ صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ ان کے ذہن میں کچھ مثبت سوالات ہیں۔ مگر ہمارے رہنما ان سوالات کے جوابات منفی انداز میں پیش کررہے ہیں۔ یہ ایک تضاد کی صورت حال ہے، اور یہی تضاد آج کے نوجوانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ آج کا نوجوان بھٹکا ہوا نوجوان نہیں ہے، بلکہ وہ متلاشی (seeker) نوجوان ہے۔

بے لاگ تجزیہ بتاتا ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے بزرگوں نے ان کو یہ بتایا کہ دورجدید ایک مخالفِ مذہب دور ہے۔ اس سوچ کے تحت ہمارے بزرگوں نے نوجوانوں کو یہ ٹارگٹ دیا کہ وہ دور جدید کو بدلیں۔ اس بنا پر ہماری کئی نسلیں خود ساختہ نظریے کے تحت دورجدید سے لڑتی رہیں۔ لیکن عملاً ان کو ناکامی کے سوا کچھ اور نہیں ملا۔

اس مسئلے کا حل صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ ہمارے بزرگ کھلے طور پر اعتراف کریں کہ ان کی نشاندہی غلط تھی۔ وہ اعلان کریں کہ دور جدید جو سائنس کی دریافتوں کے تحت بنا ہے، وہ ایک موافق مذہب دور تھا، لیکن ہمارے بزرگوں نے خلاف واقعہ طور پر اس کو مخالف مذہب دور کی حیثیت دے دی، اور ہماری جدید نسل نے بے فائدہ طور پر اس کے خلاف نظری یا عملی جنگ چھیڑ دی۔ اس کے نتیجہ میں مایوسی کے سوا ان کو کچھ اور نہیں ملا۔

اب کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ آج کے نوجوانوں کو یہ بتایا جائے کہ جدید دور ایک موافق مذہب دور ہے۔ جدید تہذیب ایک موافق مذہب تہذیب ہے۔ جدید دور نے ہمارے لیے نئے مواقع کھول دیے ہیں، جن کو اویل کرکے ہم تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ مثلاً قدیم دور توہمات کا دور (age of superstitions) تھا، آج کا دور حقائق کا دور ہے۔ قدیم دور جبر کا دور تھا، آج کا دور آزادی کا دور ہے، وغیرہ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہم نوجوانوں کو ایک امید بھرا نیا آغاز دے سکتے ہیں۔

ظلم کا بدلہ

قرآن کی ایک آیت میں مظلوم کا معاملہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الۡجَہۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیۡعًا عَلِیۡمًا (4:148)۔ یعنی اللہ پسند نہیں کرتا ظاہر کرنا بری بات، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ قرآن کی اس آیت کے مطابق، مظلوم کے لیے جائز ہے کہ وہ ظالم کے خلاف بولے۔ مگر یہ جواز رخصت کے درجے میں ہے، عزیمت کے درجے میں نہیں۔ اگر کوئی شخص ظلم پر بدلہ لینا چاہے تو اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ٹھیک اتنا ہی بدلہ لے جتنا کہ اس پر ظلم کیا گیا ہے۔ اگر وہ ظلم سے زیادہ کرے گا تو خدا کی نظر میں وہ خود ظالم بن جائے گا (النحل، 16:126، الشوری 42:40)۔

اسی لیے رسول اور اصحابِ رسول نے کبھی ظلم پر بدلہ نہیں لیا، بلکہ ان کا رویہ قرآن کے اس حکم کے تحت تھا: وَ اِذَا مَا غَضِبُوۡا ہُمۡ یَغۡفِرُوۡنَ (42:37)۔ یعنی اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کردیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی ظالم کو معاف کردے (الشوریٰ، 42:43)۔ یہی اعلیٰ اخلاق ہے۔ اعلیٰ اخلاق کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی ظالم کو معاف کرکے اس کو اپنے لیے نیکی میں کنورٹ کردیتا ہے۔ اعلیٰ اخلاق کی نسبت سے دیکھا جائے تو مظلومیت نیکی کمانے کا ایک موقع ہے۔ ظلم کے باوجود ظالم کو معاف کردینا، بلاشبہ ایک عظیم نیکی ہے۔

دعوت اور داعی کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہ اور زیادہ اہم بات ہے۔ داعی اگر ظالم کو معاف کردے تو اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مظلوم اور ظالم کے درمیان معتدل ماحول قائم ہوجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے اگر دونوں کے درمیان ظالم اور مظلوم کا تعلق تھا، تو اب دونوں کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ ظالم کو معاف کرنا، عملاً دعوت کے مواقع کھول دیتا ہے۔ ظلم پر فریاد کرنا صرف ایک رخصت کا معاملہ ہے۔ جب کہ ظلم کو معاف کردینا، داعی کا اخلاق ہے، یعنی بااصول انسان کا اخلاق ہے۔

جدید مائنڈ سٹ

میں کئی مہینے سے بیماری کے دور سے گزر رہا تھا۔ آخر کار ہمارے ساتھیوں نے ستمبر 2019 کے پہلے عشرے میں یہ فیصلہ کیا کہ مجھ کو دلی کے سب سے اچھے اسپتال میں لے جائیں۔ میں اس کے لیے راضی نہیں تھا۔ کیوں کہ نوجوانی کی عمر سے میں یہ سنتا تھا کہ اسپتال انسان کے لیے کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ مثلاً مشہور اردو شاعر اکبر الہ آبادی نے جدید دور کے بارے میں طنزیہ انداز میں لکھا تھا:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

انڈیا کے ایک معروف عالم دین کے قریبی لوگ بتاتے ہیں کہ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اللہ سے یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ اسپتال کی زندگی سے بچائے۔ مجھے دو بزرگوں کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ علاج کے لیے امریکا گئے۔ جب وہ روانہ ہونے لگے، تو ان کے معتقدین نے ان کو مشورہ دیا کہ حضرت آپ یہودی ڈاکٹروں سے علاج مت کیجیے گا۔ کیوں کہ یہودی مسلمانوں کے دشمن ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے درمیان اس قسم کا ماحول اس بات کے لیے رکاوٹ بن گیا ہے کہ وہ جدید ترقیوں سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ اپنے مائنڈ سیٹ کے مطابق جدید ترقیوں سے الرجک ہو گئے ہیں۔ ان حضرات کو یہ معلوم ہی نہیں کہ موجودہ زمانہ پروفیشنلزم (professionalism) کا زمانہ ہے۔ اب یہودی ڈاکٹر یہود کی حیثیت سے علاج نہیں کرتے، اب کرشچین ڈاکٹر کرشچین کی حیثیت سے کسی انسان کا طبی معاینہ نہیں کرتا، بلکہ خالص پروفیشنل انداز میں وہ اس کام کو انجام دیتا ہے۔

جدید ترقی کیا ہے۔ وہ دراصل خدا کے پیدا کردہ امکانات کو دریافت کرکے ان کو استعمال کرنا ہے۔ یہ ترقی غیر اسلامی ترقی نہیں، بلکہ وہ خود خدا کی تخلیق کا حصہ ہے۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کو سمجھنے میں بہت زیادہ دیر کی۔ اب انھیں بلا تاخیر اس حقیقت کو سمجھنا چاہیے، تا کہ وہ مزید نقصان سے بچ جائیں۔ (11 ستمبر 2019)

فاجر کے ذریعے تائیدِ دین

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: وَإِنَّ اللَّهَ لَيُؤَيِّدُ هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الفَاجِرِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3062)۔ یعنی بے شک اللہ ضرور اس دین کی تائید فاجر آدمی کے ذریعے کرے گا۔ صحی بخاری کی شرح میں ابن حجر نے رجل کے لفظ کو جنس کے معنی میں لیا ہے (يُحتَمَلُ أَنْ تَكُونَ لِلْجِنْسِ) فتح الباری، جلد 7، صفحہ 473۔ یعنی رجال (افراد)۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہاں رجل سے مراد سیکولر افراد ہیں، یعنی اللہ تعالی اس دین کی تائید سیکولر افراد کے ذریعے کرے گا۔

سیکولر افراد کے ذریعے دین کی تائید کا مطلب کیا ہے۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ سیکولر لوگوں کے درمیان غور وفکر کا کام نان اسٹاپ (non-stop) انداز میں جاری رہتا ہے۔ اگر آپ افکار کی تاریخ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلم اہلِ علم کے درمیان غور وفکر کا کام نان اسٹاپ انداز میں جاری نہیں تھا۔ اہلِ دین کے درمیان چوں کہ ڈائکاٹمس تھنکنگ (dichotomous thinking) کا طریقہ ہوتا ہے، یعنی سچائی دو کے درمیان ہے۔ یہ لوگ غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز کے درمیان سوچتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں بہت جلد بحث ایک حد پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔

اس کے برعکس، سیکولر لوگ اختلاف کے بجائے ڈسنٹ (dissent) کو مانتے ہیں۔ اختلاف کے مقابلے میں ڈسنٹ کا لفظ نیوٹرل (neutral) معنی میں ہے، یعنی کسی ایک سائڈ کو لیے بغیر اظہارِ رائے کرنا۔ اختلاف کے ذہن سے سوچنے والے لوگوں کے یہاں کوئی بحث مسلسل طور پر جاری نہیں رہتی۔ اس کے برعکس، ڈسنٹ کے تصور کے ساتھ جو لوگ ڈائلاگ کرتے ہیں، ان کے یہاں ممکن ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ڈائلاگ جاری رہے۔ اس طرح سیکولر لوگوں کے یہاں یہ ممکن ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر زیادہ سے زیادہ بحث ومباحثہ ہو۔ اس مزاج کی وجہ سے سیکولر لوگ دین کے زیادہ پہلوؤں پر اپنی رائے دے سکتے ہیں۔

ایک تجربہ

آج دسمبر 2019 کی 3 تاریخ ہے۔ اس وقت میں نظام الدین ویسٹ میں ایک پارک میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا ہوں۔ دھوپ نکلی ہوئی ہے، اور موسم نہایت خوشگوار ہے۔ یہاں پارک میں بیٹھ کر میں نے مولانا عبد السلام عمری (حیدر آباد) سے موبائل پر گفتگو کی۔ گفتگو کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ میں نے پہلی بار حیدر آباد کا سفر غالباً 1948 میں کیا تھا۔ اس وقت میں ٹرین کا سفر کرکے حیدر آباد پہنچا تھا۔ اس زمانے میں دلی سے حیدر آباد کا کمیونی کیشن بہت محدود معنوں میں ہوسکتا تھا۔ اب اللہ کے فضل سے کمپوٹر ایج آچکا ہے، اور یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ آسانی رابطہ قائم کیا جاسکے۔

1925 میں جب میں پیدا ہوا، اس وقت دنیا میں برٹش ایمپائر موجود تھا۔ یہ ایک پولٹکل ایمپائر تھا۔ اس وقت ایمپائر قائم کرنے کی صرف ایک صورت تھی، اور وہ یہ کہ صاحبِ ایمپائر کے پاس فوج کی طاقت موجود ہو۔ مگر آج فوج کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج کی دنیا میں اقوامِ متحدہ (UNO) کا نظام ہر ایک کو عالمی سطح پر مکمل امن دے رہا ہے۔ اگر آدمی خود سے اپنی کسی غلطی کی بنا پر اس امن کو درہم برہم نہ کرے، تو وہ پائے گا کہ ساری دنیا اس کی اپنی دنیا ہے۔ ساری دنیا اس کے لیے مکمل طور پر کھلی ہوئی ہے۔

اب ہر پر امن انسان کے لیے وہ عالمی دور آچکا ہے، جس کی پیشین گوئی پیغمبر اسلام نے ان الفاظ میں کی تھی: لَيَبْلُغَنَّ هَذَا الْأَمْرُ مَا بَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ (مسند احمد، حدیث نمبر 16957)۔ یعنی یہ امر وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک دن اور رات پہنچتے ہیں۔ میں اس وقت اپنے ساتھی کے ساتھ نظام الدین ویسٹ کے پارک میں بیٹھا ہوں، ہمارے پاس لیپ ٹاپ اور موبائل فون انٹرنیٹ کے ساتھ موجود ہے۔ پوٹنشلی (potentially) ہم ساری دنیا سے مکمل طور پر مربوط ہیں۔ کیسی عجیب ہے، اللہ کی یہ نعمت، وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (40:57)۔ یعنی لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

مسلم اور غیر مسلم تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی اصولی بنیاد کیا ہے۔ اس کو مسلم اور ذمّی یا مسلم اور حربی جیسی اصطلاحوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کے فقہی الفاظ صرف وقتی تعلق کو بتاتے ہیں، وہ دونوں کے درمیان مستقل یا اصولی تعلق کو نہیں بتاتے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کی فطری بنیاد یہ ہے کہ دونوں یکساں طور پر انسان ہیں۔ دونوں کے درمیان انسانیت کا ابدی رشتہ قائم ہے۔ انسانیت کا تعلق دونوں کے درمیان وہ فطری تعلق ہے، جو کبھی اور کسی حال میں ٹوٹنے والا نہیں۔ ہر سماج میں اور ہر ملک میں یہ انسانی رشتہ یکساں طور پر برقرار رہتا ہے۔ یہ رشتہ وہ ہے، جو پیدائش کے ساتھ ہی دونوں گروہوں کے درمیان اپنے آپ قائم ہوجاتا ہے۔ یہ ایک ایسا اٹل رشتہ ہے، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان دوسرا رشتہ وہ ہے، جو عقیدے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق، مسلمان ایک صاحب مشن گروہ ہے۔ یہ مشن وہی ہے، جو پیغمبر کا مشن تھا، یعنی خدا کے پیغام کو پُرامن طور پر دوسرے لوگوں تک پہنچانا۔ اس اعتبار سے زیادہ صحیح طور پر، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے — داعی اور مدعو، شاہد اور مشہود، ناصح اور منصوح۔

انسان کی نسبت سے مسلمانوں کے اوپر دوسرے لوگوں کے لیے وہ تمام فرائض عائد ہوتے ہیں، جو اخلاق کے عنوان سے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ انسانی اخلاقیات کی پابندی جس طرح دوسرے لوگوں کے لیے ضروری ہے، اسی طرح مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ داعی کی حیثیت سے مسلمانوں کی اخلاقی ذمے داری مزید بڑھ جاتی ہے۔ اب ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ یک طرفہ طور پر حسن اخلاق کا ثبوت دیں، تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات قائم رہیں، جو کہ مؤثر دعوتی عمل کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔

فکری آزادی کا فارمولا

سائنس نام ہے نیچرل سائنس کا۔ نیچرل سائنس ساری کی ساری اس پر مبنی ہے کہ خالق کی بنائی ہوئی دنیا کن اصولوں پر کام کرتی ہے۔ اسی دریافت (discovery) کو جب منظم انداز میں بیان کردیا جائے، تواسی کا نام سائنس ہے۔ یہ مبنی برفطرت قوانین عملاً تقریبا تیرہ بلین سال سے موجود تھے، جب کہ بگ بینگ سے کائنات کا آغاز ہوا۔ پھر کیوں ایسا ہوا کہ فطرت کے ان قوانین کو دریافت کرنے میں بہت زیادہ دیر لگی۔ حالاں کہ اس پر غور وفکر بہت پہلے سے جاری ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ فطرت کا علم یقینی طور پر مدون شکل میں موجود نہ تھا۔ بلکہ اس کو ریسرچ کرکے دریافت کرنا تھا۔ دریافت کے اس عمل میں بہت سے دماغ شامل تھے۔ ہر دماغ اپنے مطابق سوچتا تھا، اوراس کو بیان کرتا تھا۔ اس کے باوجود فطرت کا علم آگے نہیں بڑھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مختلف دماغوں کوایک سوچ پر لانے کے لیے کوئی فارمولا موجود نہ تھا۔

آخر کار مغرب کے اہل دماغ نے اس پر غور کیا۔ انھوں نے پایا کہ علوم فطرت کی دریافت کے لیے فری تھنکنگ (free thinking) بہت ضروری ہے۔ لیکن بے قید فری تھنکنگ کی صورت میں اگریمنٹ (agreement) ہونا عملاً ناممکن بن گیا ہے۔ اس لیے اہل مغرب نے اس معاملے میں ایک قابل عمل اصول دریافت کیا۔ وہ اصول تھا ڈسنٹ (dissent) کا اصول۔ ڈسنٹ کا لفظ ایک نیوٹرل ٹرم (neutral term) ہے۔ جب کہ ہر آدمی کی ایک اوپینین (opinion) ہے۔ اوپینین کو صحیح اور غلط کے معیار سے جانچنے کے بجائے مجرد طور پر آزادئ فکر (freedom of opinion) کا اصول تسلیم کیا جائے۔ اس سے ایک نیوٹرل ٹرم وضع ہوا، جس کو ڈسنٹ (dissent) کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ نظریہ کہ اپنے آپ کو صحیح سمجھتے ہوئے دوسرے کے لیے یہ امکان تسلیم کرنا کہ وہ یکساں طور پر برسرحق ہوسکتا ہے۔ اس اصول سے فکری عمل مکمل طور پر آزاد ہوگیا۔ اب ہر آدمی کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنی رائے کو آزادانہ طور پر ظاہر کرے، بغیر اس کے کہ وہ دوسرے کی رائے کو غلط یا

صحیح بتائے۔

کہا جاتا ہے کہ مشرقی دنیا میں فکری جمود کا مسئلہ ہے۔ مشرقی فکر کے مفروضہ جمود کا سبب یہ ہے کہ اہل مشرق آزادی فکر کا کوئی قابل عمل (workable) فارمولا دریافت نہ کرسکے۔ مغرب میں فکری عمل بھر پور طور پر جاری ہوا، لیکن مشرق میں فکری عمل تنگ حالت میں پڑا رہا۔ جس چیز کو فکری جمود کہا جاتا ہے، وہ نتیجہ ہے فکری عمل کے ورکیبل (workable) فارمولے کو دریافت کرنے میں ناکام رہنا۔ کیوں کہ مشرق میں تعدد فکر (diversity of thought) کے بجائے توحد فکر (unity of thought) کو اپنایا گیا۔ اہل مشرق چیزوں کو حلال وحرام کے ٹرم میں دیکھتے رہے، جس کی وجہ سے ان کے یہاں فری تھنکنگ عملاً رواج نہ پاسکی۔ ہر بار جب ایک شخص نے کوئی فکری فارمولا دریافت کیا، تو دوسرا شخص جوابی ذہن لے کر کھڑا ہو گیا کہ یہ غلط ہے، یہ ناجائز ہے، یہ حرام ہے، وغیرہ۔ مشرق میں کسی کے لیے بھی فری تھنکنگ کو اپنا کر جمہور سے الگ رائے اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں فکر وتحقیق کا کام تعطل کی حالت میں پڑا رہ گیا۔

مغرب میں فکری آزادی کا ڈیولپمنٹ واقعہ بن گیا، لیکن مشرق میں یہ واقعہ نہیں بن سکا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس معاملے میں اصل رکاوٹ اتھاریٹی کا نظریہ تھا، یعنی باتوں کو ریزن کی بنیاد پر سننے کے بجائے ''اکابر'' کی بنیاد پر سننا۔ قدیم زمانے میں ساری دنیا میں اتھاریٹی کا تصور چھایا ہوا تھا۔ تاہم مغرب میں سائنس اور چرچ کے ٹکراؤ کے نتیجے میں اتھاریٹی کا تصور کمزور ہوا، پھر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد مغرب نے نسبتاً آسانی کے ساتھ ڈسنٹ (dissent) کا نیوٹرل نظریہ اختیار کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں پوپ ڈم (popedom) کا مستند تصور ایک مدت کے رواج کے بعد ختم ہوگیا۔ اس کے برعکس، مشرق کا حال یہ ہے کہ وہاں اس قسم کا تصور اعتقادی سطح پر موجود ہے۔ مشرق میں اتھاریٹی کا تصور عقیدے پر مبنی ہے، یعنی ''اکابر'' کی اتھاریٹی۔ اس لیے وہ ختم نہ ہوسکا۔ بلکہ آج تک وہ موجود چلا آرہا ہے۔ یہاں ہر آدمی عملاً یہ مانتا ہے کہ ''اکابر'' کی رائے عقیدہ سے تعلق رکھتی ہے، اور عقیدے کے معاملے میں حرام وحلال کو دیکھا جاتا ہے، نہ کہ ریزن کو۔

آزادیٔ فکر اپنے آپ میں تنوع (diversity) چاہتی ہے۔ اس لیے آزادیٔ فکر اور توحدِ فکر دونوں یکجا نہیں ہوسکتے۔ دونوں کو یکجا کرنے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ آزادیٔ فکر کا حصول عملاً ناممکن ہوجائے گا۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس معاملے کے لیے ایک نیوٹرل فارمولا دریافت کیا جائے۔ یعنی ہر ایک یہ کرے کہ وہ اپنے آپ کو صحیح سمجھتے ہوئے دوسرے کو بھی یکساں درجے میں صحیح سمجھنے کا حق دے۔ اسی نیوٹرل آزادیٔ فکر کا نام ہے ڈسنٹ، جو آزادیٔ فکر کا واحد قابلِ عمل فارمولا ہے۔ آزادیٔ فکر ایک میوچول پراسس (mutual process) ہے، وہ یونی لیٹرل (unilateral) نوعیت کا پراسس نہیں۔

☆☆☆☆☆☆

دورِ جدید میں جن مثبت باتوں کا آغاز ہوا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اب بذریعہ تلوار اختلاف کو دور کرنے کا زمانہ ختم ہوچکا ہے، اور بذریعہ ڈسینٹ (dissent) اختلاف کو اوائڈ کرنے آغاز ہوا ہے۔ قدیم زمانے میں جب اختلاف پیدا ہوتا تھا، تو اس کا خاتمہ صرف تلوار کے ذریعے ہوا کرتا تھا۔ مثلاً قدیم عرب میں یہ سمجھا جاتا تھا: القتل انفی للقتل (قتل، قتل کے لیے سب سے بڑا روک ہے)۔

مگر اب یہ فریم ورک (framework) بدل چکا ہے۔ موجودہ دور میں اختلاف کے خاتمے کا سپورٹنگ اسٹرکچر (supporting structure) بدل گیا ہے۔ اب وسیع تباہی کے ہتھیاروں (weapons of mass destruction) نے دونوں فریقوں کو اس بات پر مجبور کردیا ہے کہ دونوں فریق اختلاف کا خاتمہ گفتگو کی میز پر کریں۔ اب جو اختلاف ختم ہوا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو ''تلوار'' کی بنیاد پر فیصلے کا بدل مل گیا ہے، اور وہ ہے ڈسنٹ (dissent)۔ انسان کی عقل نے یہ ریلائز کرلیا ہے کہ اختلاف کا خاتمہ ریزن کی سطح پر ہوسکتا ہے۔ پہلے زمانے میں حالت یہ تھی کہ اختلاف کی وجہ سے اگر کوئی فریق نہ لڑنا چاہے، تب بھی اس کو جان ومال کی قربانی دینی پڑتی تھی۔ اس کے برعکس، موجودہ دور میں ریزن (reason) کی سطح پر اختلاف کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

اسلام دورِ جدید میں

دورِ جدید میں مسلمان جن مسائل سے دوچار ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ وہ ہے، جس کو جدید تہذیب کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اپنی پوری شدت کے ساتھ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے وسط میں پیدا ہوا، اوراب اس کے اوپر ایک صدی سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس مسئلہ سے نمٹنا تو درکنار ابھی تک ہم یہ بھی سمجھ نہ سکے کہ یہ مسئلہ کیا ہے، اور اس مسئلہ میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے جدید تہذیب کا مسئلہ اصلاً یہ مسئلہ نہیں تھا کہ ماڈرن انسان ایک خاص قسم کا لباس پہنتے ہیں، اور ہم اسے پہنیں یا نہ پہنیں، یا یہ کہ گھروں میں استعمال کے لیے انھوں نے ایک خاص قسم کا فرنیچر تیار کیا ہے، اور ہم اپنے گھروں کو ان سے سجائیں یا نہ سجائیں، وغیرہ۔ یہ سوالات اسلامی یا مذہبی نہیں تھے۔ بلکہ تمدنی اور جغرافی سوالات تھے، اور تمدنی ذوق اور جغرافی حالات کے لحاظ سے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ اسلام کی نسبت سے جدید تہذیب کے مسائل حقیقۃً صرف دو تھے:

1 - یورپ میں جدید تہذیب اور چرچ کے درمیان تصادم نے غلط طور پر جدید علوم کا رخ لامذہبیت کی طرف کردیا۔ چنانچہ اس تصادم کا یہ نتیجہ ہے (نہ کہ بذاتِ خود جدید تہذیب کا) کہ اس تہذیب کے ذریعے جو علوم پیدا ہورہے ہیں، یا جو معاشرہ بن رہا ہے، وہ مذہب سے بیزاری کی طرف جارہا ہے۔

جدید تہذیب، صنعتی تہذیب کے معنی میں، وقت کی ایک دریافت تھی، اور یقیناً اس قابل تھی کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مگر جدید تہذیب نے مغربی قوموں کو جس طرح طاقت ور بنادیا، اور جدید تہذیب اور مسیحیت کے درمیان ٹکراؤ نے جس طرح اس کا رخ الحاد کی طرف کردیا، وہ اسلام کے لیے فکری چیلنج تھا، اور یہاں ضرورت تھی کہ اس کا جواب مہیا کیا جائے۔ بدقسمتی سے اسلامی دنیا بروقت اس کا ثبوت نہ دے سکی کہ وہ ان باتوں کا واضح جواب رکھتی ہے۔ اس لیے نہ تو جدید تہذیب سے صحیح

استفادہ ہوسکا، اور نہ اس چیلنج کا صحیح جواب مہیا کیا جاسکا۔

2 -اس سلسلے میں دوسرا کام جو سمجھنے کا تھا، وہ یہ کہ جدید تہذیب کے ذریعے وہ مواقع (opportunities) پیدا ہوئے، جن کو استعمال کرکے عالمی سطح پر دینِ اسلام کی اشاعت کا مطلوب کام انجام دیا جاسکے۔ دینِ اسلام کی اس عالمی اشاعت کے لیے ابتدائی زمانے میں حالات موافق نہ تھے۔ جدید تہذیب نے بالواسطہ طور پر ناموافق حالات کو مکمل طور پر موافق بنا دیا ہے۔

اس جدید تہذیب کے نتیجے میں بہت سی مثبت چیزیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً جدید تعلیم کا فروغ، حقیقت پسندانہ طرزِ فکر (realistic thinking) کا رواج، فکری جمود کا ٹوٹنا، دنیا میں پہلی بار کامل معنوں میں کھلا پن (openness) کا دور آنا، جدید وسائل کو کسی ریزرویشن کے بغیر رواج دینا، جدید کمیونی کیشن کے نتیجے میں عالمی انٹریکشن (global interaction) کا عمومی پھیلاؤ، دنیا میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ ہر آدمی کے لیے مواقع کے دروازے مکمل طور پر کھل گئے۔

دنیا میں پرنٹنگ پریس اور مواصلاتی دور (age of communication) وجود میں آیا۔ فطرت (nature) میں چھپے ہوئے موافق اسلام سائنسی حقائق دریافت ہوئے، اور عمومی طور پر وہ ہر ایک کی دسترس میں آگئے۔ دنیا میں مکمل معنوں میں مذہبی آزادی کا دور آیا، جس میں ہر ایک کو یہ موقع تھا کہ وہ جس مذہب کو چاہیں اختیار کرے، اور اس کی تبلیغ کرے، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ آدمی تشدد (violence) سے مکمل طور پر پرہیز کرے۔

جدید تہذیب مسلمانوں کے لیے حدیث کی زبان میں مؤید دین تہذیب (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3062، مسند احمد، حدیث نمبر 20454، المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 14640) تھی۔ وہ مسلمانوں کے لیے ایک عظیم موقع (great opportunity) تھا، جس کو استعمال کرکے مسلمان جدید معیار کے مطابق زیادہ مؤثر انداز میں اسلام کی اشاعت کا کام کرسکتے تھے۔ جدید تہذیب نے یہ کیا کہ اجارہ داری کے دور کو ختم کردیا۔ اس طرح انسانی آزادی کا وہ مطلوب ماحول پیدا ہوگیا، جو خدا کے نقشۂ تخلیق کے مطابق درکار تھا۔

مذہبی برداشت

مذہبی معاملات میں برداشت کا معاملہ سب سے زیادہ نازک معاملہ ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ معاملہ اگر سیکولر میدان کا ہو تو آسانی سے آدمی اس کے لیے راضی ہوجاتا ہے کہ وہ خود ایک راستے پر چلے، اور دوسرے کو دوسرے راستے پر چلنے دے۔ مگر جب معاملہ مذہبی ہو تو دونوں فریق اپنے آپ کو برحق سمجھنے لگتے ہیں، دونوں میں سے کوئی لچک (flexibility) دکھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہ بے لچک انداز مذہبی معاملات میں برداشت یا رواداری کو ختم کردیتا ہے۔ یہی بنیادی سبب ہے، جس کی بنا پر سیکولر معاملے میں آسانی کے ساتھ برداشت کا طریقہ اختیار کرلیا جاتا ہے، اور جب کہ مذہبی معاملے میں رواداری ایک حرام طریقہ نظر آنے لگتا ہے۔ آدمی کو سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ وہ کیسے ایسا کرے کہ حرام راستہ پر چلنے کے لیے راضی ہوجائے۔

اس مسئلے کا آسان حل یہ ہے کہ دونوں فریق باہمی احترام (mutual respect) کا طریقہ اختیار کریں۔ پیش آمدہ معاملے کو اخلاق کا معاملہ بنادیں، نہ کہ عقیدے کا معاملہ۔ کسی معاملے کو آپ مذہبی عقیدے کا معاملہ سمجھیں، تو ایسا معاملہ بہت جلد حرام وحلال کا معاملہ بن جاتا ہے۔ آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک طریقہ حرام ہے، اور دوسرا طریقہ حلال۔ اب آپ کو سمجھ میں نہیں آتا کہ حلال طریقے کو چھوڑ کر حرام طریقہ کیسے اختیار کریں۔ اس کے برعکس، پیش آمدہ معاملہ جب آپ کے لیے اخلاق کا معاملہ ہوجائے، تو اس وقت برداشت کا طریقہ اختیار کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں آپ کو نظر آتا ہے کہ بیجا پسپائی اختیار کیے بغیر آپ بھی اپنے راستے پر چلتے رہیں، اور دوسرا بھی اپنے راستے پر چلتے ہوئے اپنے مقام تک پہنچ جائے۔

برداشت کا طریقہ اختیار کرنے میں باہمی افہام وتفہیم کا راستہ کھل جاتا ہے۔ جب کہ اس کا برعکس راستہ اختیار کرنے میں باہمی افہام وتفہیم کا راستہ بند پڑا رہتا ہے۔ دانش مندی یہ ہے کہ معاملات کو حرام وحلال کا مسئلہ بنانے کے بجائے عملی مفاہمت کا راستہ بنادیا جائے۔

دو قرآنی آیات

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (5:32)۔ یعنی جو شخص کسی کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو قتل کرڈالا اور جس نے ایک شخص کو بچایا تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو بچالیا۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، انسان کو قتل کرنا، سب سے بڑا سوشل کرائم (social crime) ہے۔ اس معاملے میں استثنا صرف یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ایک انسان کو عمداً (intentionally) قتل کردیا، تو وہ قابلِ گردن زدنی قرار پائے گا۔ اس سلسلے میں دوسری چیز فساد فی الارض ہے۔ تفسیر المنار میں فساد فی الارض کی تفسیر سلبِ امن سے کی گئی ہے (تفسیر المنار، جلد 6، صفحہ 288)۔ یعنی ایسا فعل انجام دینا، جس سے امن عامہ ختم ہوتا ہو۔ گویا قتلِ نفس سے مراد انفرادی قتل ہے، اور فساد فی الارض سے مراد اجتماعی قتل ہے۔

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (8:39)۔ یعنی اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہوجائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے ان کے عمل کا۔ اس آیت میں فتنہ سے مراد مذہبی جبر (religious persecution) ہے۔ قرآن میں اس جرم پر قتال (war) کا حکم دیا گیا ہے۔ کیوں کہ مذہبی جبر کا فعل عام طور پر حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے یہ حکم دیا گیا کہ ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ کی یہ حالت ختم ہوجائے۔

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اسلام میں جنگ کا تصور کیا ہے۔ اس آیت میں لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ اور وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ دونوں ایک ہی حکم کے دو پہلو ہیں۔ ایک منفی پہلو، اور دوسرا مثبت پہلو۔ فتنہ سے مراد نظام فطرت میں مداخلت ہے، یعنی مذہبی جبر، اور وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ سے مراد ہے کہ

فتنہ، مذہبی جبر سے قبل جو حالتِ فطری تھی، وہ لوٹ آئے۔ اس آیت کے مطابق، جنگ کا مقصد کسی حکومت کا قیام نہیں ہے، بلکہ حکومت کی سرپرستی میں جاری مذہبی جبر کو ختم کرکے نظام فطری کو وجود میں لانا ہے، جس میں ہر ایک کو اپنے ارادے اور اختیار سے عمل کی آزادی حاصل ہو۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7095) دوسرے لفظوں میں، ہر انسان کو پرامن دائرے میں اپنا کام کرنے کا موقع مل جائے۔ تاکہ آخرت میں ہر انسان کے لیے اس کے اختیارانہ عمل کے مطابق، جزاوسزا کا فیصلہ کیا جائے۔

یہ آیت کسی محدود سیاسی معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ تاریخی پراسس کے معنی میں ہے۔ وسیع تر معنی میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے قدیم قبائلی طرز کا دور ختم ہو، جس میں اختلافات کا فیصلہ تلوار سے کیا جاتا تھا، اور دنیا میں تہذیب کا دور (civilizational age) آئے۔ تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری ہو، جس کا منتہیٰ (culmination) یہ ہو کہ نیچر میں چھپی ہوئی ٹکنالوجی دریافت ہو۔ دنیا میں ایج آف کمیونی کیشن آئے۔ آفاق وانفس میں جو موافقِ دین حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں، ان کی دریافت ہو۔ یہاں تک کہ مکمل معنوں میں دنیا میں تبیینِ حق کا دور آجائے (فصلت، 41:53)۔

یہ دراصل انبیاء کے مشن کی تکمیل ہے۔ انبیاء کا مشن یہ تھا کہ انسان جو غیر اللہ کی پرستش میں الجھا ہوا تھا، وہ ایک اللہ کی عبادت میں جینے لگے۔ فطرت کا نظام اس طرح کھل جائے کہ انسان خالق کی محبت میں اور خالق کی خشیت میں جینے لگے (البقرۃ، 2:165، التوبۃ، 9:18)۔

اس قسم کی آیات کا غور سے مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں موجود قتال کی آیتوں کا مخصوص پس منظر ہے، اور شرائط ہیں۔ ان کا لحاظ کیا جائے، تو آج قتال کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ لیکن مسلمان ان کا لحاظ نہیں کرتے ہیں، اس وجہ سے وہ جنگ وقتال میں لگے ہوئے ہیں۔

مسلح جہاد

اسلام کے کچھ احکام وقتی ہوتے ہیں، یعنی وقتی حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں حج کے سفر کے ذیل میں یہ آیا ہے: وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ (22:27)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بروقت پیدل اور اونٹ پر سفر کرکے حج کیا جائے۔ لیکن جب ہوائی جہاز کا زمانہ آجائے، تو ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کرکے حج کیا جائے۔

اسی طرح قرآن میں مسلح جہاد کا حکم وقتی ہے، یعنی جب تک دنیا میں وائلنٹ ایکٹوزم کا دور ہے، تو تم بھی بطور دفاع وائلنٹ ایکٹوزم کا طریقہ اختیار کرو۔ جب دنیا میں پیس فل ایکٹوزم کا دور آجائے، تو اس وقت مسلح جہاد مطلوب نہیں رہے گا۔ اس وقت زمانے کے تقاضے کے لحاظ سے پیس فل جہاد مطلوب ہوجائے گا۔ کیوں کہ بعد کے زمانے میں ایسے اسباب پیدا ہوں گے کہ مسلح جدو جہد غیر مطلوب ہوجائے گا۔ اس وقت سے پہلے کے دور میں مسلح عمل سے جو چیز حاصل کی جاتی تھی، وہ سب مزید اضافے کے ساتھ پیس فل طریقہ کار کے ذریعہ قابلِ حصول ہوجائے گا۔

پہلے زمانے میں طاقت کا نشان صرف تلوار ہوتی تھی۔ چنانچہ کہا جاتا تھا: ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند۔ مگر سائنسی انقلاب کے بعد ساری اہمیت علم، ٹکنالوجی اور انڈسٹری کو حاصل ہوگئی ہے۔ یہ واقعہ جنگ عظیم ثانی (1939-1945) کے بعد پیش آیا ہے۔ اس حقیقت کی طرف ایک حدیثِ رسول میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2783)۔ یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کے بعد ایک ایسا دور آنے والا تھا، جب کہ اسلام پر عمل کرنے کے لیے ہجرت کرنا غیر ضروری ہوجائے گا۔ کیوں کہ اس کے بعد سب کچھ پرامن ذرائع سے حل کرنا ممکن ہوجائے گا، یعنی وہ دور ایسا ہوگا کہ اس میں دعوتی جہاد کا عمل پرامن طریقے سے انجام دیا جائے گا— اسلام میں اصل مطلوب مقصد ہے، نہ کہ ذریعہ۔

مسلمانوں کا مسئلہ

مسلمان اور مغربی قوموں کے درمیان طویل مدت تک ایک جنگی سلسلہ چلا۔ یہ جنگی سلسلہ 1096ء شروع ہوا، اور تقریباً دوسو سال تک وقفے وقفے کے ساتھ جاری رہا۔ اس کو تاریخ میں صلیبی جنگ (Crusades) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں مسلمانوں کو مکمل فتح، اور مغربی قوموں کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ مسلمان فتح کی خوشی منانے میں مشغول ہوگئے۔ دوسری طرف مسیحی یورپ کے اندر موضوعی انداز (objective way) میں ری پلاننگ (re-planning) کا ذہن پیدا ہوا۔ انھوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ کس طرح میدانِ جنگ کی شکست کو کسی اور میدان میں کامیابی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ آخر کار انھوں نے یہ دریافت کیا کہ ان کے لیے ایک اور زیادہ بہتر میدان موجود ہے، اور وہ ہے جنگی کروسیڈس کے بجائے اسپریچول کروسیڈس۔ یعنی فطرت کے قوانین کو دریافت کرکے اس کے ذریعے دوبارہ فتح حاصل کرنا۔

اس منصوبہ بندی میں انھوں نے سوسال سے زیادہ کا عرصہ لگایا۔ یہاں تک کہ مسیحی یورپ نے واقعۃً عمل کا نیا میدان دریافت کرلیا۔ یہ دریافت فطرت کے قوانین (laws of nature) کی دریافت تھی۔ اس دریافت نے مسیحی یورپ کو ایک نئی طاقت دے دی، جس سے اب تک دنیا ناواقف تھی۔ وہ ہے جنگی طاقت کے بجائے فطرت کے قوانین کی تسخیر۔ یہ ایک انوکھی دریافت تھی۔ کیوں کہ اس نے مسیحی یورپ کو یہ موقع دے دیا کہ وہ جنگ کیے بغیر امن کی طاقت سے دنیا پر غلبہ حاصل کرلیں۔ اس دریافت کو عام زبان میں صنعتی انقلاب (industrial revolution) کہا جاتا ہے۔

مسیحی یورپ کی اس دریافت نے مسلمانوں کو بھی ایک عظیم رہنمائی دی ہے، وہ یہ کہ مسلمان مسلح جہاد کے بجائے، پرامن میدان جہاد کو اختیار کریں۔ وہ تخریب کے بجائے تعمیر کی طاقت کے ذریعے جینے کا راز دریافت کریں۔ وہ سیاسی غلبہ کی اصطلاح میں سوچنے کے بجائے انسانیت کی تعمیر (development) کی اصطلاح میں سوچیں۔

قدیم زمانہ اور جدید زمانے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قدیم زمانے میں جسمانی طاقت (muscle power) کی اہمیت ہوتی تھی۔ اب ٹکنالوجیکل پاور کی اہمیت ہے۔ قدیم زمانے میں قتل وقتال کی اہمیت تھی، موجودہ زمانے میں آرگنائزیشن کی اہمیت ہے۔ قدیم زمانے میں اہمیت یہ تھی کہ بادشاہ کے سر سے اس کا تاج چھین لیا جائے، موجودہ زمانے میں ساری اہمیت سائنس اور تعلیم کی ہوگئی ہے۔ قدیم زمانے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے محنت اہم ہوا کرتی تھی، موجودہ زمانے میں پلاننگ کی اہمیت زیادہ ہے۔ قدیم زمانے میں خطابت کی اہمیت تھی، موجودہ زمانے میں علم کی اہمیت ہے۔ قدیم زمانے میں شعر وشاعری اور انشاپردازی کی اہمیت تھی، موجودہ زمانے میں فیکٹ (fact) کی اہمیت ہے۔ قدیم زمانے میں باتوں کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوا کرتا تھا، موجودہ زمانے میں باتوں کا فیصلہ گفتگو کی میز پر ہوا کرتا ہے۔ قدیم زمانے میں الفاظ کی اہمیت ہوا کرتی تھی، موجودہ زمانے میں ساری اہمیت معانی کی ہوتی ہے۔

آج مسلمانوں کو جو اصل کام کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ زمانے کے فرق کو پہچانیں، وہ شاعری، ادب اور خطابت کے دور سے باہر نکلیں، اور علم کے دور میں جینے کا طریقہ سیکھیں۔ وہ ماضی کی فتوحات کو دہرانے کا کلچر چھوڑ دیں، اور حال کے معیار کو سمجھیں، اور اس کے مطابق اپنی تعمیرِ نو کریں۔ وہ اس بات کو جانیں کہ زندگی کا راز قومی فخر میں جینا نہیں ہے، بلکہ ساری دنیا کے ساتھ ترقی کے عمل میں شریک ہونے کا نام زندگی ہے۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ماضی کے جس دور پر وہ فخر کرتے ہیں، وہ دور اب مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ وہ جس چیز کو اپنا فخر بنائے ہوئے ہیں، وہ فرضی فخر (false pride) کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلمان آج بھی خلافت کے نام سے ایمپائر کے دور میں جی رہے ہیں۔ حالاں کہ موجودہ زمانہ نیشن اسٹیٹ کا زمانہ ہے، جس نے ایمپائر کے دور کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا ہے۔ مسلمانوں کا کیس ایک لفظ میں پیرانوئیا (paranoia) کا کیس ہے۔ پیرانوئیا کا مطلب ہے، فریب خوردگی (delusion) میں جینا۔ اس خود فریبی سے نکلنے ہی میں ان کے لیے نئی زندگی کا راز چھپا ہوا ہے۔

وطن سے محبت

28 مارچ 1998 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سیمینار تھا۔ اس کا اہتمام اردو اکادمی، دہلی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس موقع پر میں نے بھی ایک تقریر کی۔ میں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک حب الوطنی کا مسئلہ تھا۔

میں نے کہا کہ 20 ویں صدی میں لمبی مدت تک مسلم مفکرین کسی نہ کسی طور پر اس نظریہ سے متاثر رہے ہیں، جس کو عام طور پر پان اسلامزم (pan islamism) کہا جاتا ہے۔ اس میں دور جدید کے بہت سے مسلم مفکرین کے نام شامل ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کو ایک بین اقوامی برادری سمجھتے تھے، اور مسلمانوں کو ایک عالمی قومیت کا رکن بتاتے تھے۔ اپنے اس نظریے کی بنیاد پر ان کا کہنا تھا کہ قومیت (nationhood) کی بنیاد مذہب پر ہے، نہ کہ وطن پر۔

میں نے کہا کہ میری عمر ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے 78 سال ہورہی ہے۔ میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسلام اور اسلام سے متعلق علوم کے مطالعے میں گزارا ہے۔ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ قومیت کو مذہب پر مبنی قرار دینا کوئی اسلامی نظریہ نہیں۔ یہ سراسر ایک سیاسی نظریہ ہے، جو مخصوص حالات میں پیدا ہوا۔ 20 ویں صدی کے نصف اول میں مسلمان قائدین یورپی استعمار کے خلاف تمام دنیا کے مسلمانوں کو ابھارنا چاہتے تھے۔ اپنے اس سیاسی مقصد کے نظریاتی جواز کے لیے انھوں نے مذہبی قومیت کا مذکورہ نظریہ پیش کیا۔ یہ اسلام کا سیاسی استحصال تھا، نہ کہ اسلام کی حقیقی ترجمانی۔

اس معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر وہی ہے، جو پولیٹکل سائنس کا نقطۂ نظر ہے، اور جس کو تمام دنیا میں نظری یا عملی طور پر قبول کرلیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ قومیت (nationhood) کی بنیاد وطن (motherland) پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا میں پاسپورٹ پر کسی آدمی کی قومیت (nationality) وہی لکھی جاتی ہے، جو وطن کی نسبت سے اس کی ہے، خواہ وہ ایک مذہب سے تعلق رکھنے والا ہو، یا دوسرے مذہب سے۔ مثلاً انڈیا میں ہر مسلمان یا غیر مسلمان پاسپورٹ میں اپنے

آپ کو انڈین لکھتا ہے، برطانیہ میں برٹش، امریکا میں امریکن، وغیرہ۔

مبنی بر وطن قومیت کا یہ نظریہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس معاملہ میں اسلام اور بقیہ دنیا میں کوئی اختلاف یا ٹکراؤ نہیں۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے کہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اس پر کچھ لوگوں نے یہ اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا مدنی کا یہ جملہ خبر ہے، وہ انشاء نہیں۔ یعنی یہ ایک واقعہ ہے کہ بقیہ دنیا میں وطن کو قومیت کی بنیاد مان لیا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام میں بھی قومیت کی بنیاد وطن پر قائم ہے۔

مگر یہ تشریح درست نہیں۔ اس سلسلے میں یہاں میں چند باتیں عرض کروں گا۔ فقہ کا ایک مستقل اصول یہ ہے کہ چیزوں کی اصل ان کا مباح ہونا ہے (الأصل في الأشياء الإباحة):

Everything is lawful unless it is declared unlawful.

یہ ایک واضح بات ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی براہِ راست ہدایت موجود نہیں۔ قرآن وحدیث میں نہ یہ کہا گیا ہے کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے، اور نہ یہ کہ اس کی بنیاد وطن پر ہے۔ اس لیے اس معاملے کو ان امور سے متعلق سمجھا جائے گا، جن کی بابت پیغمبر اسلام نے کہا: أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2363)۔ یعنی تم اپنی دنیا کے معاملہ کو زیادہ جانتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک عقیدہ، عبادت اور آخرت کے معاملات کا تعلق ہے، ان میں مسلمان پابند ہیں کہ وہ شریعت کی رہنمائی کو تاویل کے بغیر قبول کریں، مگر جو امور انتظام دنیا سے تعلق رکھنے والے ہیں، ان میں انسان کو اختیار ہے کہ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے جس طریقہ کو درست سمجھے اس کو اختیار کرے۔

اس معاملے میں ایک پیغمبرانہ واقعے سے مزید رہنمائی ملتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یمن میں ایک شخص نے نبوت کا دعوی کیا اس کا نام مسیلمہ تھا۔ اس نے دو آدمیوں پر مشتمل اپنا ایک سفارتی وفد مدینہ بھیجا۔ انھوں نے مدینہ آ کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور مدعی نبوت کا یہ تحریری پیغام پہنچایا کہ میں نبوت میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہوں

(فَإِنِّي قَدْ أُشْرِكْتُ فِي الْأَمْرِ مَعَكَ)۔ سفارتی امور پر گفتگو کرنے کے بعد آپ نے ان دونوں سفیروں سے پوچھا کہ اس بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری بھی وہی رائے ہے جو ہمارے صاحب کی رائے ہے۔ یہ سن کر آپ نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ایسا نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا (أَمَا وَاَللّٰهِ لَوْلَا أَنّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ أَعْنَاقَكُمَا) سیرۃ ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 600۔

پیغمبرِ اسلام کے اس واقعہ سے اسلام کا ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بین اقوامی معاملات میں شریعت کا طریقہ بھی وہی ہوگا، جو دوسری قوموں کا طریقہ ہے۔ دوسری قوموں میں اگر سفیر کی جان کو ہر حال میں محترم سمجھا جاتا ہے، تو اسلام میں بھی اس کو ہر حال میں محترم سمجھا جائے گا۔ اسی طرح اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ وطنیت کے معاملہ میں دنیا میں جس اصول کو عمومی طور پر مان لیا جائے وہی شریعت میں بھی اختیار کرلیا جائے گا۔ اس معاملہ کو غیر ضروری طور پر عقیدہ اور مذہب کا مسئلہ نہیں بنایا جائے گا۔

ایک بار میں ایک جلسہ میں شریک تھا۔ وہاں ایک صاحب نے اپنی تقریر میں حب وطن کی اہمیت بیان کی، اور کہا کہ اسلام میں بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے: حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الإِيمَانِ (الدرر المنتشرۃ للسیوطی، حدیث نمبر 190)۔ یعنی وطن سے محبت کرنا ایمان کا ایک حصہ ہے۔ ایک عالم جو اس وقت جلسے میں موجود تھے، انھوں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الإِيمَانِ کوئی حدیث نہیں ہے، یہ تو صرف ایک عربی مقولہ ہے۔

میں نے کہا کہ یہ درست ہے کہ حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الإِيمَانِ حدیث نہیں۔ مگر وہ سادہ طور پر صرف عربی کا ایک مقولہ نہیں، بلکہ وہ فطرت کا ایک مقولہ ہے، جو انسانی نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ محدثین عام طور پر اِس قول کو حدیثِ رسول نہیں مانتے، وہ اِس کو ضعیف یا موضوع قرار دیتے ہیں۔ تاہم کچھ علماء نے اس قول کو معنوی اعتبار سے درست قرار دیا ہے۔ مثلاً آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم محمد بن عبد الرحمن السخاوی (وفات 1497ء) نے اِس قول کو ذکر کرنے کے بعد لکھا

ہے: لم أقف عليه، ومعناه صحيح (المقاصد الحسنۃ، حدیث نمبر 386)۔ یعنی میں اِس سے واقف نہیں، لیکن اس کا مفہوم درست ہے۔ محدثین کے اصول کے مطابق، السخاوی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ یہ قول حدیثِ رسول کے طور پر ان کو نہیں ملا، لیکن دینِ اسلام میں اس کی اصل پائی جاتی ہے۔ کتابوں کے ذخیرے میں بہت سی چیزیں ہیں، جو خواہ حدیث رسول نہ ہوں، لیکن وہ یقینی طور پر حدیثِ فطرت ہیں۔ اس بات کو بتانے کے لیے محدثین نے وہ اصول بنایا ہے، جس کو السخاوی کے حوالے سے اوپر بیان کیا گیا۔

راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ یہ قول اگر کلامِ رسول کے طور پر ثابت شدہ نہ ہو، تب بھی وہ حدیثِ فطرت ہے۔ جو آدمی حُبّ الوطنی کو فطرت کا جز نہ سمجھتا ہو، وہ جانتا ہی نہیں کہ فطرت کیا چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وطن سے محبت انسانی فطرت کا ایک لازمی تقاضا ہے، اور فطرت کا تقاضا ہونا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ حُبّ الوطنی (patriotism) کو اسلام کا ایک حصہ سمجھا جائے۔

میں نے کہا کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس لیے فطرتِ انسانی کا ہر صحیح تقاضا بھی عین اسلام کا تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر حدیث میں کہیں یہ نہیں آیا ہے کہ حب الام من الایمان (ماں کی محبت ایمان کا حصہ ہے)۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہر مسلمان اس کو اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس کے دل میں اپنی ماں سے محبت ہو۔ جس آدمی کے دل میں اپنی ماں کی محبت نہ ہو، وہ اپنے ایمان میں بھی کامل نہ ہوگا کیونکہ فطرت اور ایمان میں کوئی تضاد نہیں۔

وطن سے محبت بھی بلا شبہ ہر مسلمان کے لیے ایک ایمانی تقاضے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی جس ملک میں پیدا ہوا، جہاں اُس کی پرورش ہوئی، جہاں کی ہوا میں اس نے سانس لیا، جہاں کے لوگوں سے اس کے تعلقات قائم ہوئے، جہاں اُس نے اپنی زندگی کی تعمیر کی، ایسے ملک سے محبت کرنا انسانی شرافت کا تقاضا ہے، اور اِسی طرح وہ انسان کے ایمان واسلام کا بھی تقاضا۔

میں نے کہا کہ جو چیز فطرتِ انسانی کا جز ہو، اس کو قرآن وحدیث میں لکھنے کی ضرورت نہیں وہ قرآن وحدیث میں لکھے بغیر ہی شریعت کا ایک لازمی جز ہے۔ قرآن وحدیث میں یہ حکم نہیں دیا گیا

کہ اے مسلمانو، تم اپنی ماں سے محبت کرو۔ کیوں کہ یہ چیز حکم کے بغیر اپنے آپ ہی فطرت کے زور پر حاصل تھی۔ اسی طرح قرآن وحدیث میں یہ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں کہ اے مسلمانو، تم اپنے وطن سے محبت کرو۔ کیوں کہ وطن سے محبت انسانی شرافت کا تقاضا ہے، وہ انسان ایک پست انسان ہے جس کے دل میں اپنے وطن کے لیے محبت نہ ہو۔ ایسے گہرے فطری تقاضے کے لیے شریعت میں کسی لفظی حکم کی ضرورت نہیں، وہ اپنے آپ ہر مومن کے دل میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔

یہاں ایک معاملے کی وضاحت ضروری ہے۔ بعض انتہا پسند لوگوں نے لکھا ہے کہ ہندستان کے عیسائی اور مسلمان سچے محب وطن نہیں ہوسکتے۔ اس لیے کہ محب وطن ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس وطن یا اس جغرافی خطہ کو آدمی مقدس سمجھتا ہو، جہاں وہ پیدا ہوا ہے۔ ہندو چوں کہ اپنے وطن (ماتر بھومی) کو مقدس سمجھتا ہے، اور اس کو معبود کا درجہ دیتا ہے۔ اس لیے وہی بھارت کا سچا محبِ وطن (دیش بھکت) ہے۔ عیسائی اور مسلمان چوں کہ اپنے مخصوص عقیدے کی بنا پر زمین یا کسی زمینی خطے کو معبود کی طرح مقدس نہیں سمجھ سکتے، اسی لیے وہ بھارت کے سچے دیش بھکت بھی نہیں ہوسکتے۔

یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے خود ساختہ عقیدے کی بنا پر اپنی ماں کو معبود مان لے، اور اس کی پرستش کرنے لگے، تو اس بنا پر اس کو یہ کہنے کا لائسنس نہیں مل جائے گا کہ اس کے سوا بقیہ لوگ اپنی ماں سے محبت نہیں کرتے، کیوں کہ وہ اپنی ماں کو معبود نہیں سمجھتے۔ کسی شخص یا گروہ کو بلاشبہ یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی ماں کو یا اپنے وطن کو معبود سمجھنے لگے۔ مگر کسی بھی قانون یا اصول کی بنا پر ایسے لوگوں کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ دوسروں کے بارے میں یہ حکم لگائیں کہ وہ اپنی ماں کو یا اپنے وطن کو معبود مانیں، ورنہ وہ اپنی ماں سے محبت کرنے والے قرار پائیں گے، اور نہ اپنے وطن سے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات کا تعلق عالمی سطح پر مانے ہوئے رواج سے ہے، نہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اپنے مفروضہ سے۔ عالمی اور بین اقوامی سطح پر جب یہ مان لیا گیا ہے کہ قومیت کی بنیاد وطن پر ہے، اور وطن سے مراد معروف معنوں میں جغرافی وحدت ہے، نہ کہ پُراسرار معنوں میں تقدیسی وحدت۔ اس لیے حب الوطنی (patriotism) کا معیار ہر ایک کے لیے یہی

ہوگا۔ البتہ ہر ایک کو یہ آزادی حاصل رہے گی کہ وہ اس کے علاوہ کوئی اورعقیدہ پسند کرتا ہوتو اس کو اپنے لیے اختیار کرلے۔

مادرِ وطن کہنا

ایک صاحب نے بذریعہ ای میل یہ سوال کیا کہ انڈیا کو مادرِ وطن کہنا جائز ہے، یا ناجائز۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مادرِ وطن کو جائز یا ناجائز کی اصطلاح میں بیان کرنا اس کو غیرضروری طور پر شرعی مسئلہ بنانا ہے۔ یہ انتہا پسندی ہے کہ ہر چیز کو جائز یا ناجائز کا مسئلہ بنایا جائے۔ اس مزاج کو شریعت میں غلو کہا گیا ہے، اور قرآن وسنت میں غلو کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی وابصۃ الاسدی رسول اللہ کے پاس آئے۔ وہ بہت سا سوال کرنا چاہتے تھے۔ رسول اللہ نے ان کے سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ یہ کہا: اسْتَفْتِ قَلْبَكَ (مسند احمد، حدیث نمبر 18006)۔ یعنی اپنے دل سے فتویٰ پوچھو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر بات کو شرعی مسئلہ نہ بناؤ۔ بلکہ اپنی فطرت کی آواز کی پیروی کرو۔

جو لوگ انڈیا کو مادرِ وطن کہتے ہیں۔ وہ اس معنی میں نہیں کہتے کہ وہ اسی جغرافیہ کے بطن سے پیدا ہو کر نکلے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ استعارہ (metaphor) کی زبان ہے۔ اصل یہ ہے کہ مادر وطن سے مراد وہی چیز ہے، جس کو دوسرے الفاظ میں وطن مالوف، مسقطِ رأس، ہوم لینڈ (homeland)، مقامِ پیدائش (birth place)، جنم بھومی، وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اگر بالفرض کچھ لوگ مادر وطن کا لفظ اس معنی میں بولیں کہ وہ وطن کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوئے ہیں، جس طرح کوئی شخص ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہوگا، نہ کہ آپ کا معاملہ۔ آپ مادرِ وطن کا لفظ اپنے مفہوم میں بولیے۔ دوسرے لوگوں کو چھوڑ دیجیے کہ وہ کس معنی میں اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی زندگی کی ایک حکمت ہے کہ کسی بات کو اس کی منطقی حد (logical end) تک نہ پہنچایا جائے۔

مادر وطن (بھارت ماتا) کی اصطلاح انیسویں صدی کے آخری زمانے میں شروع کی گئی۔ یہ آزادی کی تحریک چلانے والے لیڈروں نے سیاسی مقصد کے تحت استعمال کیا تھا۔ اس اصطلاح کا کوئی مذہبی پس منظر نہیں۔

جدید اسلوب کا ایک پہلو

ایک مسلم رائٹر کسی شخص کے بارے میں لکھے گا تو وہ اس طرح لکھے گا کہ شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ ان ذی علم ہستیوں میں سے ایک تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تجدید کے لیے پیدا فرمایا۔ دین کے مجددین کی فہرست میں انھیں خصوصی مقام حاصل ہے۔

لیکن سیکولر رائٹر کی زبان یہ نہیں ہوتی۔ سیکولر رائٹر کسی چیز کو اس کے میرٹ پر جانچتا ہے، وہ اس کو اس کے تاریخی پہلو سے دیکھتا ہے۔ اس کا معیار یہ ہوتا ہے کہ آبجیکٹیو (objective) انداز میں جو کچھ ثابت ہو، وہی قابل حوالہ ہے، اور جو چیز آبجیکٹیو انداز میں ثابت نہ ہو، وہ عقیدے کا موضوع ہے، نہ کہ علم کا۔ رائٹر (writer) کے لیے اس اصول کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ اس کی تحریریں کچھ صاحب عقیدہ لوگوں کے لیے قابل مطالعہ ہوسکتی ہیں، لیکن دوسرے لوگوں کے لیے ان کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔

عام دینی علما اور مستشرق اہل علم کے درمیان یہی فرق ہے۔ مستشرق عالم ایسی باتوں کی بنیاد پر لکھتا ہے، جو دینی مآخذ کے باہر آزادانہ حوالوں سے ثابت شدہ قرار پاتی ہوں۔ جو باتیں آزادانہ حوالوں سے ثابت شدہ نہ ہوں، وہ مستشرقین کے لیے قابل حوالہ نہیں۔

خواہ لکھنے کا معاملہ ہو، یا بولنے کا معاملہ۔ صحیح اسلوب یہ ہے کہ آدمی حقیقت نگاری کا طریقہ اختیار کرے۔ تعریف نگاری اور بلا دلیل تنقید، دونوں سے وہ دور رہے۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ غلط رواج وہ ہے، جس میں افراد کو فضیلت کی زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ افراد کو اسی نام سے یاد کیا جائے، جو ان کا اصل نام ہے۔ ان کے نام کے ساتھ بڑے بڑے القاب اور فضیلت کا اسلوب ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ صحابہ کے زمانے میں یہی طریقہ رائج تھا۔ بڑھا چڑھا کر نام لینا، اور نام کے ساتھ فضیلت کے القاب شامل کرنا، یہ سب صحابہ کے زمانے میں نہیں تھا۔ صحیح اسلوب حقیقت نگاری کا اسلوب ہے، نہ کم، نہ زیادہ۔

فریم ورک کا مسئلہ

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مصنف کی کتاب ہے، جس کا نام یہ ہے:

A Modern Approach to Islam by Dr A. A. Faizi (1899-1981)

میں نے اس کتاب کو مکمل طور پر پڑھا ہے۔ اس پر ایک تبصرہ بھی لکھا ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق، اس کتاب میں مسئلہ کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں اسلام کا اصل مسئلہ ماڈرن اپروچ کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ سائنٹفک انقلاب کے بعد اسلوب کے اعتبار سے فریم ورک (framework) بدل گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسلام کی دعوت کو جدید فریم ورک کے اعتبار سے پیش کیا جائے۔ مثلاً موجودہ زمانے میں ادبی اسلوب ایک متروک اسلوب بن چکا ہے۔ اب دنیا میں سائنٹفک اسلوب کا رواج ہے۔ تبدیلیٔ اسلوب کے سلسلہ میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حسب ذیل کتاب:

The Great Intellectual Revolution by John Frederick West (J. Murray, 1965, pp.132)

اس کتاب کا ایک چیپٹر اس عنوان سے ہے: تمثیلی اسلوب کا خاتمہ (The Death of Metaphor)۔ یہ چیپٹر اس موضوع پر بحث کرتا ہے۔ تمثیلی اسلوب (metaphor) میں ادبی اسلوب بھی شامل ہے۔ یہاں ادبی اسلوب کی ایک مثال درج کی جاتی ہے۔ ایک معروف عالم دین اور مورخ نے اپنی دینی کتاب سیرت النبی کے دیباچہ میں یہ بتایا ہے کہ اسلام عرب میں کیوں آیا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں: معمورۂ عالم کے صفحے نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے۔ اب ایک سادہ، بے رنگ، ہر قسم کے نقش ونگار سے مُعرّیٰ ورق درکار تھا، جس پر طُغرائے حق لکھا جائے۔

یہ ادبی اسلوب کی مثال تھی۔ اب ماڈرن سائنٹفک فریم ورک کے اعتبار سے یہ کہا جائے گا کہ یہ پوری عبارت ادبی اسلوب میں ہے۔ اس سے متعین (specific) انداز میں معلوم نہیں ہوتا کہ جو واقعہ ہوا، وہ کیا تھا۔ اس کے برعکس، اس واقعہ کو سائنٹفک اسلوب میں کہا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ

اسلام کے ظہور کا معاملہ دو فیزز (phases) سے تعلق رکھتا ہے۔ پیغمبر ابراہیم نے اپنی اہلیہ ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو اس صحرائی مقام پر بسایا جہاں اب مکہ واقع ہے۔ یہ گویا ڈزرٹ تھرپی (desert therapy) کا معاملہ تھا۔ اس صحرائی ماحول میں دو ہزار سالہ توالد وتناسل کے ذریعہ ایک نسل بنو اسماعیل تیار ہوئی، جو ماحول کی کنڈیشننگ سے پاک تھی۔ یہ ڈی کنڈیشنڈ قوم (deconditioned nation) بڑی حد تک اپنی فطرت پر قائم تھی۔ اس ڈی کنڈیشنڈ نسل میں پیغمبر اسلام نے اپنا مشن شروع کیا۔ پیغمبر ابراہیم نے اس مشن کو باعتبار تربیت شروع کیا، اور پیغمبر اسلام نے اس مشن کو عملی اعتبار سے تکمیل تک پہنچایا۔

مذکورہ عالمِ دین نے عرب قوم کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ ایک ادبی اسلوب تھا، اور ادبی اسلوب جدید فریم ورک کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس، اوپر جو لکھا گیا، وہ جدید فریم ورک کے اسلوب کی مثال ہے۔ ہمارے مصنفین کی کتابوں میں اصل کمی یہی ہے۔ میرے تجربے کے مطابق، ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے، جو جدید فریم ورک کے مطابق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتابیں عصری ذہن کو ایڈریس نہیں کرتیں۔ ان کتابوں میں عصری ذہن کو کوئی ٹیک اوے (takeaway) نہیں ملتا۔ اور جب پڑھنے والے کو ٹیک اوے نہ ملے تو ایسی تحریروں کو پڑھنا، اور نہ پڑھنا برابر ہوجاتا ہے۔ مسلم مصنفین کی جو کتابیں ہمارے کتب خانے میں موجود ہیں، ان کا بڑا حصہ اسی قسم کا ہے جو جدید علمی معیار پر پورا نہیں اترتا۔

اعلان

مثال کے بغیر

بینکنگ (banking) کی اصطلاح میں ایک لفظ ہے ڈَڈ چیک (dud cheque) ۔یعنی ایسا چیک جس کے حق میں بینک میں ضروری رقم (cash) موجود نہ ہو۔ایسی ہی مثال اس مضمون یا کتاب کی ہے، جس میں بڑی بڑی باتیں بیانیہ انداز میں ہوں، مگر ان باتوں کے حق میں کوئی ثابت شدہ دلیل موجود نہ ہو۔

مثال کے بغیر تحریر کا یہ انداز قدیم دور میں عام تھا۔جب سائنس کا زمانہ آیا، تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ متعین مثال کے بغیر کوئی تقریر یا تحریر اتنی ہی بے قیمت ہے، جتنا کہ بینک کی اصطلاح میں ڈَڈ چیک (dud cheque) ۔مثلاً آپ کہیں کہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی عالم ادب کے آفتاب و ماہتاب تھے، یا محمد اقبال اور محمد علی جناح برصغیر کی مسلم سیاست میں عہد ساز مفکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔تو ایسا بیان علمی اعتبار سے ڈڈ چیک کی حیثیت رکھتا ہے۔کیوں کہ ان بیانات میں جو بات کہی گئی ہے، وہ بیانیہ انداز میں ہے، دلیل کے انداز میں نہیں۔

جو لوگ اس طرح کے بیان کی کمزوری کو نہ جانتے ہوں، ان سے میں کہوں گا کہ وہ ایک کتاب کے صرف ایک باب کو پڑھ لیں۔یہاں کتاب کا م نام اور اس باب کا نام لکھا جاتا ہے:

The Great Intellectual Revolution, by John Frederick West, (Chapter: The Death of Metaphor) J. Murray, 1965, pp. 132.

جیسا کہ معلوم ہے کہ بینک کسی ڈڈ چیک پر لکھے ہوئے اماؤنٹ (amount) پر کوئی ادائیگی نہیں کرتا، جب تک اس چیک کے حق میں بینک میں ضروری رقم موجود نہ ہو۔اسی طرح ایسا مضمون جو دعوی کی زبان میں ہو، لیکن اس میں کوئی مثال نہ دی گئی ہو، ایسے مضمون کو پڑھنے سے قاری کو کوئی ٹیک اوے (takeaway) نہیں ملتا ہے۔ایسا مضمون صرف ڈڈ چیک کی مانند ہے۔ اس میں نہ لکھنے والے کے لیے کچھ ہوتا ہے، اور نہ پڑھنے والے کے لیے کچھ۔ایسا مضمون لکھنا اور پڑھنا، دونوں صرف وقت کا ضیاع ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

بے خبری کا کیس

آج کل جس مسلمان سے بات کیجیے، وہ ہمیشہ ایک ہی بات کو دہرائے گا، اور وہ مسلمانوں پر ظلم کی بات ہے۔ اگر ان سے مزید گفتگو کیجیے تو وہ اخباری نیوز کا حوالہ دیں گے۔ اخباری نیوز کیا ہیں، وہ یک طرفہ خبر رسانی کی مثالیں ہیں۔ قرآن کے مطابق، ایسی خبروں کو مان لینا درست نہیں ہے، بلکہ رائے بنانے سے پہلے غیر جانبدارانہ انداز میں ان کی تحقیق کرنا چاہیے۔

جو لوگ ظلم کی داستان سناتے ہیں، یا اسلاموفوبیا (Islamophobia) کی باتیں کرتے ہیں، ان سب پر قرآن کی یہ آیت صادق آتی ہے: یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَیَّنُوا أَنْ تُصِیبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِینَ (49:6)۔ یعنی اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچادو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

اخبار (newspaper) یا میڈیا کیا ہے۔ میڈیا منتخب خبروں (selective news) کی انڈسٹری ہے۔ میڈیا کا کام نیوز کو فروخت (sell) کرنا ہے۔ اسی کو صحافت کی دنیا کہا جاتا ہے۔ میڈیا کو معلوم ہے کہ لوگ سنسنی خیز خبروں کو پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے میڈیا سنسنی خیز خبروں کو اکٹھا کرکے ان کو چھاپتا ہے۔ لوگوں میں انھیں خبروں کا چرچا ہوتا ہے، پھر لوگ اسی قسم کی خبروں کو لے کر اپنی رائے بناتے ہیں۔ آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ صحافت ان کے لیے ذہن سازی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ لوگوں کی منفی سوچ کا سبب یہی ہے۔

لوگوں کو یہ جاننا چاہیے کہ اس قسم کی خبروں کو ماننا، گویا سنی سنائی خبروں کو لے کر اپنا ذہن بنانا ہے۔ یہ بات عملاً ناممکن ہے کہ لوگوں کے درمیان اس قسم کی خبروں کا چرچا نہ ہو۔ البتہ ایک ذمے دار انسان یہ کرسکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کی خبروں سے بچائے، وہ اخباری نیوز پر یقین نہ کرے، وہ خود اپنی سوچ کے مطابق اپنا ذہن بنائے۔ آپ اپنے آپ کو غیر متاثر ذہن کے ساتھ رہنا سیکھ لیں۔

جمہوریت کا نظام

جمہوریت (democracy) کے بارے میں اکثر لوگ منفی رائے رکھتے ہیں۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ جمہوریت کا نظام ایک غلط نظام ہے۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ لکھنے اور بولنے والے، جمہوریت کو غلط معیار (yardstick) سے ناپتے ہیں۔ حالاں کہ جمہوریت کو ایک معیاری نظام قرار دے کر اس کو آئیڈیل سے ناپنا بجائے خود غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت ایک قابل عمل نظام ہے، نہ کہ آئیڈیل نظام۔

کسی سماج میں سیاسی نظام قائم کرنا، ایک ایسا کام ہے، جو کبھی آئیڈیل پیمانے پر نہیں ہوسکتا۔ آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ آپ لوہے یا پتھر کا ایک پل (bridge) بنانے کے لیے اس کا ایک پیشگی نقشہ بنائیں، اور پھر ضروری سامان اکٹھا کر کے اپنے نقشے کے مطابق لوہے یا پتھر کا ایک پل بنائیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ آپ لوگوں کو مجبور کریں کہ وہ پل یا سڑک کے اوپر ہمیشہ ایک انداز سے سفر کریں، وہ کبھی اس سے گزرنے کے لیے غیر معیاری انداز اختیار نہ کریں۔ پل ہمیشہ مٹیریل کے ذریعے بنتا ہے، اور پل یا روڈ پر چلنے والے زندہ انسان ہوتے ہیں۔ آپ کوئی مادی عمارت مقررہ نقشے پر تعمیر کر سکتے ہیں، لیکن زندہ انسان کا ایک واحد نقشہ بنانا ممکن نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کا نظام پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کے اصول پر بنتا ہے، نہ کہ آئیڈیل وزڈم (ideal wisdom) کے اصول پر۔ جو چیز پریکٹکل وزڈم پر بنائی جائے، اس کو آئیڈیل وزڈم کے معیار پر ناپنا اصولی طور پر ایک غلطی ہے۔ ایسی غلطی کبھی درست فیصلے تک پہنچانے والی نہیں۔

یہ دانش مندی ہے کہ جب آئیڈلزم (idealism) کا حصول ممکن نہ ہو، تو پریکٹکل وزڈم کے اصول پر زندگی کا نقشہ بنایا جائے۔ جو لوگ ایسا نہ کریں، وہ ہمیشہ ناقد بنے رہیں گے۔ وہ نہ کبھی مثبت رائے تک پہنچیں گے، اور نہ کبھی مثبت انجام تک۔

اتحادِ ملّت

ملت میں اتحاد ایک بے حد مطلوب چیز ہے۔ لیکن اتحاد کا راز صرف ایک ہے — اختلاف کے باوجود متحد ہونا۔ اتحاد (unity) کبھی اس طرح پیدا نہیں ہوتا کہ سب لوگوں کی رائے بالکل ایک ہوجائے۔ رایوں کا اختلاف ایک فطری امر ہے۔ اختلاف ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق یہ بالکل ناممکن ہے کہ اختلاف سرے سے موجود نہ رہے۔ اتحاد ایک بہت بڑی عبادت ہے۔ لیکن اتحاد ایک عملی ضرورت ہے، نہ کہ اعتقادی ضرورت۔

انسان ایک سوچنے والی مخلوق ہے۔ مختلف انسانوں کی سوچ کبھی یکساں نہیں ہوسکتی۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ لوگوں کی سوچ میں یکسانیت (uniformity) نہ ہو۔ اس لیے اختلاف کو مٹا کر اتحاد کو قائم کرنے کی شرط ایک ناممکن شرط ہے۔ اختلاف کو مٹا کر اتحاد قائم کرنا، ہمیشہ کاؤنٹر پروڈکٹو (counter-productive) ثابت ہوتا ہے۔ اگر آپ اختلاف کو ختم کر کے اتحاد پیدا کرنا چاہیں، تو ایسی کوشش ہمیشہ الٹا نتیجہ پیدا کرے گی۔ اس لیے اگر آپ اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو لوگوں کے اندر برداشت اور رواداری کی صفت پیدا کیجیے۔ لوگوں کو بتائیے کہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا، یہی اتحاد ہے۔ تمام لوگوں کو ہم خیال کر کے اتحاد پیدا کرنا، ایک ناممکن چیز کی کوشش کرنا ہے۔

کسی گروہ میں اگر اختلاف رائے پیدا ہو، تو اس کو ایک صحت مند علامت سمجھیے — لوگوں سے ڈسکشن کیجیے، لوگوں سے پر امن ڈائلاگ کیجیے، ڈسکشن کے بعد اگر لوگ اپنی رائے بدل لیں، تو اس پر اللہ کا شکر کیجیے، اور اگر لوگ رائے بدلنے پر تیار نہ ہوں، تو آپ بذاتِ خود اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنے کا طریقہ اختیار کیجیے، اور اسی کو خیر سمجھیے۔

اختلافِ رائے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) موجود ہو۔ لوگوں کے اندر کھل کر سوچنے کا مزاج موجود ہو اور لوگ فکری جمود کی برائی سے بچے ہوئے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ شکر کی بات ہے، نہ کہ ٹکراؤ کی بات۔

کفر، تکذیب

قرآن میں ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ (5:10)۔ یعنی اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری نشانیوں کی تکذیب کی، ایسے لوگ دوزخ والے ہیں۔ اس طرح کی آیتوں میں کفر اور تکذیب بآیات اللہ کا کیا مطلب ہے۔ متداول تفسیروں کے مطابق اس قسم کی آیتوں میں کفر سے مراد ہے نبوت کا انکار۔ اب سوال یہ ہے کہ تکذیب آیات کا کیا مطلب ہے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی حقیقت کو دو پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے۔ کفر سے مراد ہے، نبوت کا بحیثیت عقیدہ انکار، اور تکذیب آیات سے مراد ہے، اس مسئلے پر بیان کردہ دلائل کو خود ساختہ توجیہات کے ذریعے نا قابلِ قبول قرار دینا۔

مثلاً یہ ماننا کہ انبیا ہمیشہ بنی اسرائیل کی نسل میں پیدا ہوئے۔ اس لیے بنی اسماعیل میں نبی کا پیدا ہونا قابل قبول بات نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو یہود نے آپ کو نبی برحق ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ کی طرف سے جو نبی آئے، وہ سب کے سب بنی اسرائیل میں آئے، یعنی قبیلۂ یہود میں۔ پیغمبر عربی اس کے برعکس، بنی اسماعیل میں پیدا ہوئے ہیں، ان کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں ہے۔ اس لیے وہ نبی برحق کے طور پر قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح یہود کے روایتی عقیدے کے مطابق، ہدایت ایک نسلی حقیقت تھی، یعنی ایک مخصوص نسل میں پیدا ہونے سے آدمی کو ہدایت مل جاتی تھی۔ پیغمبر اسلام نے ہدایت کو ایک پیدائشی چیز کے بجائے، ذاتی انتخاب (choice) کی چیز بتایا۔ یہ بات بھی یہود کے لیے اپنے روایتی عقیدے کے مطابق نا قابلِ فہم تھی۔ اس بنا پر وہ بیک وقت دو جرم کے مرتکب قرار پائے، نبوت کا بطور عقیدہ انکار کرنا، اور اس معاملے میں بیان کردہ دلیل کو نہ ماننا۔ اس بنا پر ان کا کیس کفر کا کیس بھی تھا، اور تکذیب کا کیس بھی۔ مسلمانوں نے اس سے مشابہ یہ غلطی کی کہ انھوں نے سچائی کو اپنے اپنے مسالک اور فرقوں سے منسوب کر دیا، اور اس معاملے میں کسی بھی دلیل کو ماننے سے انکار کر دیا۔

میل ملاپ کا سماج

کلدیپ نائر (Kuldip Nayar) 1923 میں سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے، اور 2018 میں انڈیا میں ان کی وفات ہوئی۔ تقسیم کے وقت وہ سیالکوٹ چھوڑ کر انڈیا آ گئے۔ یہاں انھوں نے انگلش جرنلزم میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ اپنے ابتدائی زمانے میں وہ اردو زبان میں لکھا کرتے تھے۔ انڈیا آنے کے بعد وہ دہلی کے اردو اخبار (وحدت) میں کام کرنے لگے۔ اس زمانے میں ان کی ملاقات حسرت موہانی (1951-1878) سے ہوئی، جو کہ اردو کے شاعر تھے۔ انھوں نے کلدیپ نائر میں انگلش کی صلاحیت محسوس کی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ انگلش صحافت میں اپنا کیریر بنائیں۔ کلدیپ نائر نے حسرت موہانی کے مشورے کو مان لیا، اور پھر انگلش اخباروں میں لکھنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ انگلش کے ممتاز صحافی بن گئے، اور ترقی کرتے کرتے انڈیا میں کئی اعلیٰ مناصب حاصل کیے۔ کلدیپ نائر کے تعلقات ہندو مسلم دونوں سے بہت اچھے تھے۔

تقسیم (1947) سے پہلے برصغیر ہند میں میل ملاپ کا سماج تھا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں سے فائدہ پہنچتا تھا، اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے فائدہ ملتا تھا۔ اس طرح دونوں کے درمیان اچھے تعلقات قائم تھے۔ اچھے تعلقات کے نتیجے میں دونوں کو ایک دوسرے سے فائدہ پہنچتا تھا، اور دونوں ترقی کر رہے تھے۔ تقسیم کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان تعلقات خراب ہو گئے۔ اب مصلحین نے یہ کوشش کی کہ اجلاس اور سیمیناروں کے ذریعے دونوں کے درمیان دوبارہ بہتر تعلقات قائم کیے جائیں۔ مگر اس کوشش میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بہتر سماجی تعلقات فطری طور پر قائم ہوتے ہیں۔ وہ جلسہ اور سیمینار کے ذریعے قائم نہیں ہوتے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے دونوں کے درمیان فطری عمل کے ذریعے اچھے تعلقات قائم تھے۔ مگر تقسیم کے بعد جب یہ فطرت پر مبنی تعلقات ٹوٹ گئے، تو وہ دوبارہ پہلے کی طرح قائم نہ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہتر سماجی تعلقات فطری عمل کے ذریعے بنتے ہیں، نہ کہ مصنوعی تدبیروں کے ذریعے۔

مثبت لٹریچر کی ضرورت

ایک مدرسہ کے طالب علم نے کراچی بک فیر 2019 میں سی پی ایس انٹرنیشنل کے اسٹال پر آکر اپنا تاثر ان الفاظ میں نقل کیا ہے: چار سال قبل میں عورتوں کے بارے میں عرب کے دورِ جاہلیت سے بھی بدتر سوچتا تھا۔ میرے بڑے بھائی نے مولانا (وحید الدین خاں) صاحب کی کتابوں کے مطالعہ پر زور دیا۔ اس وقت میری ذہنی حالت بدتر ہورہی تھی، میں سوچ سوچ کر اتنا پریشان ہوگیا کہ میں نے خودکشی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ایک دن میں بڑے بھائی کی لائبریری گیا، کتابیں دیکھتے ہوئے میری نظر مولانا صاحب کی کتاب ''انسان کی منزل'' پر پڑی۔ میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے ذہن سے بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے بعد مجھے مولانا صاحب کی مزید کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت کسی نے مجھے عورت کے بارے میں اسلام کا غلط تصور بتایا کہ اسلام عورتوں کو کمتر درجہ دیتا ہے۔ اب میں عورتوں کے بارے میں اسلام سے کچھ حوالہ چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ انھیں قید کرنے کی اسلام میں مجھے اجازت مل جائے گی۔ میں نے اسی نیت سے مطالعہ شروع کیا۔ لیکن جب میں نے کتاب پڑھی، تو انسانوں کے درمیان مجھے اپنا وجود جنگلی محسوس ہونے لگا۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ مرد افضل ہے عورت سے۔ مطالعہ کرنے کے بعد میری سوچ کا پیمانہ بدل گیا۔ میں نے یہ کتابیں پڑھیں — خاتونِ اسلام، خاتونِ جنت، عورت معمارِ انسانیت، وغیرہ۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے دوسروں کا احتساب کرنے کے بجائے خود کا احتساب شروع کیا۔ گھر میں عورتوں کے ساتھ میں نے غلط رویہ ختم کردیا۔ میرے اندر بدلاؤ آیا تو میں نے اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ عورت کا بھی درجہ ہے، وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے، جیسے کہ مرد۔ اب گھر میں میں عورتوں سے جھگڑا نہیں کرتا ہوں۔ میں اب یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے رب نے دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔ (محمود السلام قاسمی، کراچی، 8 دسمبر 2019)

اس تاثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کے نوجوان طبقے کی رہنمائی کے لیے مثبت لٹریچر کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔

ملّت کا احیا

ملّت کی بعد کی نسلوں میں قانونِ فطرت کے مطابق، زوال آتا ہے۔ زوال آنے کے بعد ملت کے اندر احیائے نو کا کام کس طرح کیا جائے، اس کا طریقہ قرآن میں پیشگی طور پر بتادیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: جان لو کہ اللہ زمین کو زندہ کرتا ہے اس کی موت کے بعد، ہم نے تمھارے لیے نشانیاں بیان کردی ہیں، تاکہ تم سمجھو (الحدید، 57:17)۔

یہاں ایک فطری تمثیل کے ذریعے ملت کے احیائے نو کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق زمین پر دو موسم آتے ہیں، سوکھے کا موسم اور بارش کا موسم۔ سوکھے کے موسم میں کھیت سوکھ جاتے ہیں، کھیت کی ہریالی باقی نہیں رہتی۔ اس وقت کسان یہ کرتا ہے کہ بارش کا موسم آتے ہی وہ دوبارہ پانی اور کھاد کو استعمال کرکے اپنے کھیت کو تیار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ سوکھی زمین دوبارہ ہری بھری زمین بن گئی۔

فطرت کی یہ مثال بتاتی ہے کہ ملت کے رہنماؤں کو ملت کے احیاء نو کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ وہ ایسا نہ کریں کہ سوکھی زمین کو کسی دشمن کی سازش کا نتیجہ بتا کر احتجاج کی تحریک شروع کردیں۔ بلکہ وہ کسان کی طرح یہ کریں کہ ملت کی زمین کو فرد کی سطح پر دوبارہ ہموار کریں، اور ملت کے پودے، یعنی ہر ہر فرد کی فکری اعتبار سے تعمیر کریں۔

وہ زراعت کے اصول کو ملّت کے معاملے میں اپلائی (apply) کرتے ہوئے، ملت کو دوبارہ شاداب بنائیں۔ جس طرح کسان کی محنت مبنی بر پودا ہوتی ہے، اسی طرح ملت کے رہنماؤں کی ساری محنت مبنی بر افراد ہونی چاہیے۔ ملت کا زوال دراصل افراد کے زوال کا نام ہے۔ ایسا وقت آنے پر ملت کے رہنماؤں کو یہ کرنا ہے کہ وہ افراد کی تعمیر کا کام کرنے کی کوشش کریں۔ اسی سے ملت کو دوبارہ زندگی ملے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ملت کے احیا کا کام افراد کے احیا سے شروع ہوتا ہے۔ افراد کے اندر اسپرٹ کو زندہ کرنے کے بعد ملت اپنے آپ زندہ ہوجاتی ہے۔

Date of Posting 10th and 11th of advance month | Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2018-20
Published on the 1st of every month | RNI 28822/76
Posted at NDPSO | Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2019-20